(الاجر النبیل علی الصبر الجلیل)

(عظیم صبر پر بہترین اجر)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تنبیہ	۷
۲	تمہید	۸
۳	عقائد کی درستگی ازالۂ غم کا سبب ہے	۹
۴	غم کا ہلکا اور قابل برداشت ہونا	۱۰
۵	غم میں کمی مقصود ہے	۱۱
۶	مجاہدے کا فائدہ	۱۱
۷	تاثیر اشیاء	۱۲
۸	اعمالِ شرعیہ کے تاثیر	۱۳
۸	حکایت	۱۴
۹	کلماتِ اذان کی تاثیر	۱۵
۱۰	حلاوتِ اسلام	۱۵
۱۱	اصل محبوب کا لطف	۱۶
۱۲	جاہل صوفیا کا رد	۱۷
۱۳	قرب الٰہی	۱۸
۱۴	اسلام کا اثر	۱۸
۱۵	ترجمہ وربط آیت	۱۹
۱۶	علوم نبوت میں تدریجاً ترقی	۲۰
۱۷	حضور ﷺ کے بشر ہونے کی حقیقت	۲۱
۱۸	سجدہ علی القدم اور سجدہ القدم میں فرق	۲۲
۱۹	حضور ﷺ کی شانِ امتیاز	۲۲
۲۰	رد اشکال	۲۲
۲۱	پرندوں کی گفتگو	۲۳

۲۲	تدریجاً درجہ کمال عطاء کرنے میں حکمت	۲۴
۲۳	عورتوں کی عادت	۲۶
۲۴	علم میں تدریجی ترقی	۲۶
۲۵	زلات انبیاء کی حکمت	۲۸
۲۶	سوال	۲۸
۲۷	جواب	۲۸
۲۸	شانِ نبوی کی شانِ ابراہیمی سے مشابہت	۲۹
۲۹	سوال	۳۰
۳۰	جواب	۳۰
۳۱	ربط آیت	۳۱
۳۲	غلبۂ خوف وخشیت	۳۱
۳۳	زیادتی از حدود	۳۲
۳۴	انوکھا فیصلہ	۳۲
۳۵	ہم زاد کا علاج	۳۳
۳۶	تقویٰ میں غلو کی مثال	۳۴
۳۷	فاتحہ اور میلاد منانے کا رد	۳۵
۳۸	قیام مدارس اور ایجادات بدعت نہیں	۳۶
۳۹	رفع شبہ	۳۷
۴۰	رعایت حدود	۳۸
۴۱	حاکمانہ جواب	۳۹
۴۲	قرآن کی خوبی	۴۰
۴۳	حکیمانہ جواب	۴۰
۴۴	اجازتِ سفارش	۴۱
۴۵	ممانعت استغفار کی وجہ	۴۱
۴۶	تفسیر آیت	۴۲

۴۷	تمہید مقصود ہے	۴۳
۴۸	کھانا کھانے والے کو سلام کرنے کی ممانعت کی وجہ	۴۳
۴۹	غم وفکر کا علاج	۴۴
۵۰	شیخ چلی کی حکایت	۴۵
۵۱	رنج وغم کی بنیاد	۴۵
۵۲	دنیا کی حالت	۴۶
۵۳	تخفیف مصیبت پر حکایت	۴۷
۵۴	حصول راحت کا گر	۴۷
۵۵	غم دور کرنے کا طریقہ	۴۸
۵۶	طبعی غم کا فائدہ	۴۹
۵۷	مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا حال	۴۹
۵۸	قطع تجویز کا فائدہ	۵۰
۵۹	موت کے وقت اہل اللہ کا حال	۵۱
۶۰	اجتماع ضدین	۵۲
۶۱	ایک سوال اور اسکا جواب	۵۲
۶۲	بعض لوگوں کے غم کے کم نہ ہونے کی وجہ	۵۳
۶۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا اعتماد	۵۴
۶۴	حضرت ہاجرہ کا بھروسہ	۵۴
۶۵	حضرت ہاجرہ کا عجیب ایمان	۵۵
۶۶	ایمان اعجب کی تعریف	۵۵
۶۷	فکر آخرت	۵۶
۶۸	تفویض کا فائدہ	۵۷
۶۹	اتباع شیخ	۵۹
۷۰	شیخ پر اعتماد	۵۹
۷۱	حیات کی حقیقت	۶۰

۷۲	مجذوبوں کا حال	۶۱
۷۳	نباتات میں عقل وروح	۶۱
۷۴	پانی کی روح	۶۱
۷۵	نمرود کی بدعقلی	۶۲
۷۶	رفع اشکال	۶۳
۷۷	حقیقت موت وحیات	۶۴
۷۸	تمام تصرفات کا مالک اللہ ہے	۶۵
۷۹	خوشی کی اقسام	۶۵
۸۰	بخل وسخاوت کی حقیقت	۶۶
۸۱	اچھے اور برے اخلاق کی حقیقت	۶۶
۸۲	مسئلہ تقدیر کا فائدہ	۶۷
۸۳	چھوٹے بچوں کی موت میں حکمت	۶۸
۸۴	ماں باپ کے حق میں بچوں کی سفارش	۶۹
۸۵	اولاد ہونے یا نہ ہونے میں حکمت	۷۰
۸۶	وقت مصیبت تسلی کا طریقہ	۷۲
۸۷	ام سلیم رضی اللہ عنہا کا صبر	۷۲
۸۸	سوال وجواب	۷۳
۸۹	قراءات متعددہ کا فائدہ	۷۴
۹۰	خلاصہ سلوک	۷۵
۹۱	سالکین کو تنبیہ	۷۵
۹۲	سالکین پر بوجھ	۷۶
۹۳	تعلق مع اللہ کا فائدہ	۷۷
۹۴	اہل اللہ کی خوشی	۷۸
۹۵	وقت مصیبت کا مراقبہ	۷۸
۹۶	موت کے وقت محبین کا حال	۷۹
۹۷	پاکیزہ زندگی	۸۰

وعظ

(الاجر النبیل علی الصبر الجلیل)

(عظیم صبر پر بہترین اجر)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ ''الاجر النبیل علی الصبر الجلیل'' حافظ جلیل احمد صاحب علی گڑھی (جو حضرت کے خلیفہ اور مولانا وکیل احمد شیروانی کے والد تھے) کی فرمائش پر بیان فرمایا جب وہ اپنے بیٹے نبیل احمد کے انتقال کے بعد بغرض تسلی علی گڑھ سے تھانہ بھون آئے تھے حکیم الامت نے اپنے گھر میں کرسی پر بیٹھ کر ۲۳ شعبان ۱۳۴۶ھ کو صبح ۳۰۔۸ بجے وعظ شروع فرمایا جو چار گھنٹہ پانچ منٹ تک جاری رہا۔

سامعین تقریبا ۵۰ مرد اور عورتیں اس کے علاوہ تھیں، علامہ ظفر احمد عثمانی نے ضبط فرمایا۔ موضوع تھا ''تصحیح عقیدہ کو ازالہ غم میں بہت دخل ہے اور ضعف عقیدہ سے غم بڑھتا ہے'' عجیب اتفاق یہ ہے کہ احقر کی اہلیہ شدید بیمار تھیں عمر ہسپتال لاہور کے ICU میں داخل تھیں جس کے باہر بیٹھ کر احقر نے اس وعظ پر عنوانات وحواشی لگائے اسی دوران بروز پیر صبح ۳۰۔۸ بجے ۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ کو ان کا انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے مجھے اور میرے بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس وعظ کے مطالعہ سے احقر کو کافی تسلی ہوئی قارئین سے مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کی درخواست ہے۔ موقع غم پر تسلی حاصل کرنے کے لئے اس وعظ کا مطالعہ ہر طبقہ کو مفید ہے۔ فقط

خلیل احمد تھانوی

۱۴۳۴/۴/۲۱ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ط وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ﴾(۱)

تنبیہ

حضرت خطبہ پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ آنے والے لوگ اندرونی درجہ میں آنے لگے حالانکہ وہاں جگہ مطلق(۱) نہ تھی اسپر فرمایا کہ تم لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ اندر جگہ نہیں رہی آنکھیں بند کئے ہوئے ہر شخص چلا آرہا ہے یہ نہیں ہوتا کہ باہر جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں۔ اگر فرش پر جگہ نہ ملے تو اپنا ہی کپڑا اچھا لیں یا زمین پر بیٹھ جائیں کپڑے میلے ہوجائیں تو دھلوالیں۔ ہم لوگوں کی تمام حرکات بے اصول و بے ربط ہیں اس کے بعد کچھ بیان شروع فرمانا چاہا تھا کہ ایک صاحب پنسل کاغذ سنبھال کر وعظ لکھنے بیٹھے حضرت نے فرمایا کہ آپ بھی بیان قلمبند کریں گے تو آپ میرے سامنے نہ بیٹھیں بلکہ آڑ میں بیٹھیں جہاں میری نظر آپ پر نہ پڑے کیونکہ

(۱) بالکل۔

اس طرح میری طبیعت منتشر ہوتی ہے کہ کئی کئی آدمی لکھنے بیٹھ گئے جن میں کوئی تو اجازت سے لکھ رہا ہے کوئی بلا اجازت، کسی کومشق ہے کسی کو نہیں اس پر وہ صاحب کاغذ پنسل کو ڈال کر سامنے ہی بیٹھے رہے حضرت نے فرمایا کہ کیا اب ضبط کرنے کی نیت نہیں رہی کہا نہیں فرمایا تو پھر شروع ہی کیوں کیا تھا کیا وہ لغو حرکت تھی اس پر وہ خاموش ہوئے تو فرمایا کہ میں نے تو تم کو طریقہ بتلادیا ہے کہ آڑ میں بیٹھ جاؤ اور ضبط کرتے رہو اور اگر اب ضبط کی نیت نہ رہی تب بھی آڑ میں بیٹھ جاؤ کیونکہ اس صورت میں بھی تم کو دیکھ دیکھ کر مجھے وحشت ہوگی کہ یہ وہ ہے جس نے لغو حرکت شروع کی تھی اس پر وہ اُٹھ کر آڑ میں بیٹھے اور حضرت نے فرمایا کہ طلبہ میں آزادی بہت ہی آگئی ہر شخص خود مختار ہوگیا کہ جو چاہتا ہے کرلیتا ہے یہی وہ مرض ہے جو دیو بند کے طلبہ میں بڑھ کر ان واقعات کا سبب بن گیا جو آجکل ظاہر ہورہے ہیں اس کے بعد بیان شروع فرمایا۔

تمہید

یہ ایک آیت ہے سورۂ توبہ کی جس کا حاصل یہ ہے کہ اسمیں اللہ تعالیٰ نے اپنا مالک الملک ومِلک (۱) ہونا ظاہر فرمایا ہے۔

اس وقت کے بیان سے مقصود اور غرض یہ ہے کہ ہمارے بعض احباب کو بعض واقعات حزن پیش آئے ہیں جس کا اثر ان کے قلب پر معمول سے زیادہ ہوا کچھ تو شدتِ واقعہ کی وجہ سے کچھ ضعفِ قلب کی وجہ سے۔ اور وہ اس وقت اسی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں تاکہ دین کی باتیں سن کر کچھ دل کو تقویت ہو اُن کے آنے کے ساتھ ہی میرے قلب میں یہ بات آئی تھی کہ اس کا سب سے بڑا اعلاج تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہے اور تصحیح عقائد سے مراد یہ ہے کہ عقائد صحیحہ کی یاد دہانی کی

(۱) اپنے مالک اور بادشاہ ہونے کو بیان فرمایا ہے۔

جائے کیونکہ بحمداللہ سامعین اور صاحب واقعہ سب کے عقائد صحیح ہیں مگر واقعات حزن (۱) میں ان کی طرف التفات نہیں ہوتا اور نہ ان کو بالقصد ذہن میں حاضر کیا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس سے بے خبر ہیں کہ ان عقائد کو ازالۂ غم میں (۲) دخل ہے۔

عقائد کی درستگی ازالۂ غم کا سبب ہے

اس وقت میں اسی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں اور تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہی سے اس حزن وغم کا علاج کرنا چاہتا ہوں اس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر بیان فرمایا ہے ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔ یہ تو ترجمہ ہے مگر اصطلاحی لفظوں میں اس کا حاصل یہی ہے کہ تصحیح عقائد سے ہدایت ہوجاتی ہے کیونکہ ایمان کے یہی معنی ہیں۔ اب رہا یہ کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تصحیح عقائد سے غم زائل ہوجاتا ہے کیونکہ یہاں ازالۂ غم کا کوئی ذکر نہیں صرف ہدایت کا ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بیشک صرف ہدایت کا ذکر ہے مگر ہدایت کے لئے مفعول کی ضرورت ہے جو اس جملہ میں مذکور نہیں تو سیاق وسباق میں تامل (۳) کر کے مفعول مقدر کرنا چاہئے سو اس سے پہلے ارشاد ہے ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کہ کوئی مصیبت بدوں اذن (۴) خداوندی کے نہیں پہنچتی اس کے بعد ہے ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کے دل کو ہدایت ہوجاتی ہے یعنی اسی مضمون سابق کی کہ وہ مسئلہ قدر ہے اس کو ہدایت ہوجاتی ہے اس طرح سے اس کو مسئلہ تقدیر پر جزم واطمینان حاصل ہوجاتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو ازالۂ غم کی ہدایت

(۱) غم کے واقعات میں (۲) غم دور کرنے میں (۳) غور کر کے (۴) بغیر اللہ کے حکم کے۔

ہوجاتی ہے کیونکہ ﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ کا مضمون ہی ایسا ہے جس کے استحضار سے مصیبت وغم زائل ہوجاتا ہے تو مضمون مذکور اور ازالۂ غم کی ہدایت گویا دونوں مترادف ہیں اور اس کی بڑی دلیل مشاہدہ ہے جو لوگ اس مضمون پر جازم ومطمئن (۱) ہیں ان کی حالت کو دیکھ لیا جائے کہ وہ مصائب وحوادث میں کیسے مستقل وصابر وشاکر رہتے ہیں غرض تصحیح عقیدہ کو ازالۂ غم میں بڑا دخل ہے مگر ازالہ سے مراد تسہیل وتخفیف ہے (۲) اور یہی مطلوب ہے، زوالِ کلی مراد نہیں کیونکہ طبعی غم کا زوال مقصود نہیں بلکہ اس کی خفت مطلوب ہے ہاں اس خفت کے لئے لازم یا مثل لازم کے زوال ہے اور مثل لازم اس لئے کہا کہ بعض ضعیف طبائع کو عمر بھر بھی خفیف سا غم یا کلفت رہتی ہے مگر اس کا ازالہ خود مطلوب ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ اذیت نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت کلفت تو کھانے میں بھی ہوتی ہے چنانچہ ظاہر ہے خصوصاً آرام طلب لوگوں کو تو منہ میں لقمہ لے جانا ہی بارگراں ہے چنانچہ واجد علی شاہ کے زمانہ کے احدیوں کو چھاتی پر رکھا ہوا بیر بھی منہ میں ڈالنا دشوار تھا وہ اس کام کے لئے راستہ چلتے ہوئے سواروں کو پکارتے تھے کہ ذرا یہ بیر سینہ پر سے اٹھا کر ہمارے منہ میں ڈالدو مگر کیا ان احمقوں کی رائے کو کوئی معتبر کہے گا اور کھانے پینے کو مصیبت یا دشوار کہے گا ہرگز نہیں چنانچہ قرآن میں بھی جوع کو تو مصائب میں شمار کیا گیا ہے اکل (۳) کو مصیبت نہیں کہا گیا۔

غم کا ہلکا اور قابل برداشت ہونا

یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ (یھد قلبه) کے لئے مفعول مقدر کیا جائے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ مقطوع عن المفعول ہو اور معنی یہ ہوں (من یؤمن باللّٰه

(۱) پختگی سے کاربند (۲) غم کا ہلکا اور قابل برداشت ہونا ہے (۳) کھانے۔

یحصل له الهداية ای الوصول الی المطلوب) کہ جس شخص کے عقائد صحیح ہوں اس کے دل کو ہدایت ہوجاتی ہے یعنی وہ ان مصائب وحوادث کے حکم واسرار سے باخبر ہوتا ہے اس لئے اس کو مصیبت مصیبت نہیں رہتی کیونکہ کوئی مصیبت اپنی ذات سے مصیبت نہیں بلکہ محل کے اعتبار سے مصیبت ہے ممکن ہے کہ جو چیز ایک محل میں مصیبت ہو دوسرے محل میں مصیبت نہ ہو چنانچہ قطع جلد تندرست کے لئے مصیبت ہے مگر مریض محتاج آپریشن کے لئے صحت ہے فاقہ تندرست کو مصیبت ہے اور مریض بدہضمی کے لئے راحت وصحت ہے وعلی ہذا۔ اسی طرح یہ حوادث انفس واموال واولاد غیر عارف کے لئے مصائب ہیں مگر عارف کے لئے جو حکم تکوینیہ کو سمجھتا ہے مصائب نہیں۔

غم میں کمی مقصود ہے

بہر حال تصحیح عقائد واعمال کو تخفیف وازالۂ غم میں بڑا دخل ہے اس لئے میرا ارادہ ہوا کہ اسی کا بیان کروں اور اس کے بعد بھی اگر کچھ غم رہے تو یہ نہ کہا جائے کہ علاج سے شفا کو تخلف (۱) ہوا ہر گز نہیں غم میں خفت ضرور ہوگی اور یہی مطلوب ہے، زوال مطلوب نہیں۔

مجاہدے کا فائدہ

اور یہاں سے میں تصوف کا بھی ایک مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اخلاق رذیلہ (۲) کا جو مجاہدہ سے علاج کیا جاتا ہے اس سے بھی تخفیف ہی مقصود ہے یعنی ان کا ایسا تقاضا نہیں رہتا جو مفضی الی المعصیت (۳) ہوجاوے۔ زوال

---

(۱) علاج سے شفاء نہیں ہوئی (۲) برے اخلاق (۳) جو گناہ تک پہنچادے۔

مقصود نہیں کہ مطلق داعیہ واثر ہی نہ رہے[1] پس مجاہدہ کے بعد اگر رذیلہ کا اثر خفیف باقی رہے تو اس سے بددل نہ ہوں اور اس کو مجاہدہ کی ناکامی نہ سمجھیں کیونکہ تمام رذائل طبعی ہیں اور ان میں فی نفسہ مذموم[2] کوئی نہیں بلکہ بوجہ افضاء الی المعصیت کے مذموم لغیرہ ہوجاتے ہیں[3] اور اگر کسی میں خلق رذیل موجود ہو[4] مگر اس سے معصیت صادر نہ ہو[5] تو وہ خلق رذیل ہی نہیں نہ اس کے بقا سے غم ہونا چاہئے۔ یہ بات تصوف کے متعلق درمیان میں یاد آگئی تھی اس لئے اس کو حل کردیا گیا۔

تاثیر اشیاء

میں یہ کہہ رہا تھا کہ خفیف غم کا عمر بھر باقی رہنا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ غم مطلقاً مضر نہیں ہے اگر غم فی نفسہ مذموم یا مضر ہوتا[6] تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے غم تجویز نہ ہوتا حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے غم تجویز ہوا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے غم تجویز ہوا پس غم کو فی نفسہ مضر کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ افضاء الی اخلال الدین کی وجہ سے مضر ہے[7] ہاں یہ ضرور ہے کہ غم سے دنیا کا ضرر بہت ہوتا ہے جیسے ضعف یا مرض وغیرہ تو میں اسی لئے ازالہ غم کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں اور میں اسی آیت سے یہ بھی ثابت کروں گا کہ غم فی نفسہ مضر نہیں ہاں اسکا التزام ضروری ہے کہ انسان خود اپنے لئے غم کو تجویز نہ کرے۔ صاحبو! عقائد اسلامیہ میں سے ہر عقیدہ کو ازالۂ غم میں بڑا دخل ہے اور اس کی لم اور وجہ[8] بیان

---

(۱) نہ تقاضہ ہو نہ اثر رہے (۲) اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی برا نہیں (۳) چونکہ وہ گناہ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں اس لئے برے ہیں (۴) برے اخلاق (۵) مگر گناہ نہ کرے (۶) برا یا نقصان دہ ہوتا (۷) جب غم کی زیادتی کی وجہ سے دین میں خلل آئے تو مضر ہوگا (۸) اس کی علت اور وجہ۔

کرنے کی مجھے ضرورت نہیں بلکہ اسلام کا بالخاصہ یہی اثر ہے کہ اس سے سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطباء جانتے ہیں کہ بعض اشیاء مفید بالکیفیت (۱) ہیں اور ان کے افادہ کی لم بیان ہوسکتی ہے اور بعض مفید بالخاصہ (۲) ہیں جن کی افادہ کی لم بیان نہیں ہوسکتی مثلاً مقناطیس وقوت کہربائیہ میں جو فوائد ہیں وہ سب بالخاصہ ہیں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور زلزلہ آنے سے کچھ پہلے مقناطیس کی یہ قوت کیوں زائل ہوجاتی ہے آخر اس کی کیا لم ہے۔ نیز اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے گدگدی کیوں نہیں اُٹھتی دوسرے ہی کے ہاتھ سے اٹھتی ہے۔ عربی میں گدگدی کو دغدغہ کہتے ہیں شاید اسی کو بگاڑ کر گدگدی بنایا گیا ہو غرض ثابت ہوا کہ بعض اشیاء موثر بالخاصہ ہیں اس لئے ان کی لم اور وجہ بیان نہیں ہوسکتی اور میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر دوا موثر بالخاصہ (۳) ہی ہے کیفیت کا نام ہی نام ہے کیونکہ مثلاً بنفشہ کے مزاج کی جو کیفیت ہے یعنی جس درجہ میں اس کی حرارت دبوست (۴) ہے اسی درجہ کی حار ویابس دوائیں بہت ہیں مگر وہ زکام میں گل بنفشہ کی طرح نفع نہیں کرتیں اور ہم جیسے طالب علموں کو طب میں مہارت نہیں تو خدا نے عقل تو دی ہے اس لئے وہ طب کے بعض مسائل میں عقلی گفتگو کر سکتے ہیں۔

اعمال شرعیہ کی تاثیر

اور خیر طب کے متعلق کوئی میرا قول مانے یا نہ مانے لیکن عقائد واعمال شرعیہ کے متعلق تو میں یہی کہوں گا کہ سب مفید بالخاصہ ہیں اور میں اس پر قسم کھا سکتا

(۱) کیفیت کے اعتبار سے مفید ہے (۲) اس کے فائدہ کی وجہ بیان کی جاسکتی ہے اور جو خاصہ کے اعتبار سے مفید ہیں ان کے افادہ کی وجہ نہیں بیان ہوسکتی (۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر دواء کے اندر ایک خاص اثر رکھا ہے جو دوسری میں نہیں اسی لئے بعض دوائیں جو کہ دونوں گرم ہوں لیکن ایک اثر کرتی ہے دوسری نہیں (۴) گرمی و خشکی۔

ہوں اور کیوں نہ قسم کھاؤں اول تو مجھے اس کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی نہ ہوتا تو حق تعالیٰ کا ارشاد کافی ہے ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾(۱) ﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ﴾(۲) میں نے ایک اخبار میں ابھی ایک حکایت دیکھی ہے کہ امریکہ میں یا اور کہیں ایک بہت بڑا انگریز مسلمان ہوا ہے جو بڑے درجہ کا اور بڑا مالدار آدمی ہے وہ سینما کی کمپنی میں افسر تھا جس میں بائسکوپ اور فونوگراف کو ملا کر تماشا کیا جاتا ہے اُس نے اپنے اسلام کا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ہم کو یہ خیال ہوا کہ مسلمانوں کی اذان کا تماشا کیا جائے اور اذان کی آواز کو بند کر کے مؤذن کا فوٹو لیا جائے چنانچہ اس غرض کے لئے ہم نے ایک عربی مؤذن کو بلایا اور ہم آلات لیکر بیٹھے اُس نے اذان دینا شروع کی بس یا تو ہم نے تماشے کے لئے مؤذن کو بلایا تھا یا خود ہی تماشا بن گئے یعنی کلمات اذان سے دل پر ایک چوٹ لگی اور میری حالت ہی بدل گئی جب مؤذن اذان دے چکا تو میں نے اس کو اپنے خاص کمرے میں بلایا اور تنہائی میں اسلام کی تعلیم کو پوچھنا شروع کیا اور اس طرح اسلام قبول کرلیا۔ دیکھئے حالانکہ اس شخص نے اذان کے کلمات کو سمجھا بھی نہ ہوگا کیونکہ اذان تو انگریزی میں نہیں ہوتی۔

حکایت

جیسے ایک سرحدی نے کہا تھا کہ اذان پشتو میں ہوتی ہے وہ بیچارہ ہندوستان آیا تھا اردو سمجھتا نہ تھا اور پشتو کوئی بولتا نہ تھا اس لئے بڑا پریشان ہوا ایک مدت کے بعد تنگ ہو کر کہنے لگا کہ یہاں کوئی پشتو نہیں جانتا البتہ صرف دو چیزیں پشتو میں ہوتی ہیں ایک تو اذان پشتو میں ہوتی ہے دوسرے کتے پشتو میں بھونکتے ہیں (کیونکہ سرحد اور ہندوستان کی اذان یکساں تھی اور دونوں جگہ کے کتے بھی

(۱) آگاہ رہو اللہ کے ذکر سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے (۲) جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔

ایک ہی طرح بھونکتے ہیں ۱۲) تو کوئی ایسا عقلمند ہو تو اس کے نزدیک اذان انگریزی اور پشتو میں ہوسکتی ہے ورنہ اذان تو سب جگہ عربی میں ہوتی ہے اور عربی کو انگریز کیا سمجھے خاص کر تماشا کمپنی کا ملازم۔

کلماتِ اذان کی تاثیر

اور اگر سمجھا بھی ہو تو اذان ایک مختصر کلام ہے جو محض اعلان نماز کے لئے اسلام میں مقرر کیا گیا ہے نہ اس میں دلائل و براہین ہیں نہ کوئی طویل مسئلہ ہے ہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبرائی کے ساتھ اسلام کے اصل الاصول توحید و رسالت کا اعلان ہے مگر اسی کا دیکھئے کیسا اثر ہوا۔ پھر جو مؤذن سینما کمپنی میں اجرت پر اذان دینے آیا ہوگا اس کی معلومات کا حال بھی معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی معلومات کیا ہوں گی پھر اس اذان میں اخلاص بھی نہ تھا چند پیسوں کے لئے بے محل اذان دی تھی مگر ایک کافر کو ہدایت کرنے کے لئے اسلام کا اس شان کا ادنیٰ مؤذن بھی کافی ہے بشرطیکہ مخاطب کی طبیعت میں سلامتی اور انصاف ہو اور اس سے اندازہ کیجئے کہ زیادہ اور خالص علوم اسلامیہ کی تو کیا شان ہوگی ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند(۱)

سو وہ نومسلم انگریز لکھتا ہے کہ مجھے اس مؤذن سے تعلیمات اسلام کا جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اُسی سے مجھے اسلام کی طرف میلان شروع ہوا اور بالآخر میں نے اسلام قبول کرلیا۔

حلاوت اسلام

اب اسلام کے بعد اس کا کیا حال ہوا وہ لکھتا ہے کہ بس اسلام کی اور

(۱) خاک آلود شراب کا ایک گھونٹ جنون پیدا کردیتا ہے اگر خالص شراب پئے تو نہ معلوم کیا حال ہوجائے۔

برکات کو تو بیان کرنا طویل ہے ایک ظاہر اور کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جو سکون وراحت میرے قلب کو اسلام کے بعد حاصل ہوا ہے یہ کبھی حاصل نہ تھا مجھے اس سکون وراحت کی خواب میں بھی زیارت نہ ہوئی تھی وہ لکھتا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اب میری یہ حالت ہے کہ تمام دن اکیلا کمرہ میں پڑا رہتا ہوں اور اسلام کی حلاوت کے مزے لیتا ہوں۔ بس میں ہوں اور خدا کی یاد ہے نہ کسی سے ملنے کی خواہش رہی نہ سیر وتفریح کی نہ مال کی محبت رہی نہ مکانات وجائیداد کی۔ ہائے! جو شخص عمر بھر لہو ولعب میں مشغول رہا اب دفعۃً اس کی وہ حالت ہوگئی کہ ؎

خلوت گزیدہ رابتماشاچہ حاجت ست
چوں کوئے دوست ہست بصحراچہ حاجت ست(۱)

اصل محبوب کا لطف

صاحبو! دل صاف ہوجائے تو اسی کے اندر ایسی بہار نظر آتی ہے کہ کسی باغ اور تفریح گاہ کی طرف التفات نہیں ہوتا مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر عقل یکدم باخود آر　　　بدم در تو خزاں ست وبہار(۲)

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ستم اگر بدست کشد گہ بسیر سرو سمن درآ　　　تو زغنچہ کم ندمیدۂ درِدل کشا بچمن درآ(۳)

اور جس کو یہ دولت حاصل ہو اس کو کسی تکلیف اور مصیبت کی پروا نہیں رہتی بلکہ وہ

(۱) خلوت میں بیٹھے ہوئے شخص کو تماشہ کی کیا ضرورت ہے جب اسے خلوت میں کوچہ محبوب کا لطف آتا ہے تو اس کے صحرا میں جانے کی کیا ضرورت ہے (۲) اے بھائی اپنی عقل کو خود اپنے پر ڈال تو تجھے اپنے اندر ہی خزاں وبہار کے مناظر نظر آئیں گے (۳) اگر ہمت ہو تو کبھی باغ کی سیر کے لئے بھی آؤ تم نے کلیاں تو دیکھی ہی نہیں ہیں دل کو کشادہ کرکے باغ میں آکر دیکھو تو سہی۔

ہر حال میں خوش رہتا ہے کیونکہ اس کو ایک بڑی دولت حاصل ہے جس کے یہ خواص ہیں ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں فوق گردون ست نے قعر زمیں
باتو دوزخ جنت ست اے جاں فزا بے تو جنت دوزخ ست اے دلربا(۱)

غرض اسلام سے یہ دولت حاصل ہوتی ہے کہ بندہ کو خدا مل جاتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اتصالِ بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس(۲)

جاہل صوفیاء کا رد

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جاہل صوفیہ کی طرح یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں سما جائیگا اور نعوذ باللہ وہ انسان کے دل میں اتر آئیگا اور جہلاء صوفیہ نے اس دعویٰ پر آیت ﴿ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴾ سے استدلال کیا ہے جس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ خدا تمہارے اندر ہے پھر کیا دیکھتے نہیں ہو مگر یہ استدلال وترجمہ غلط محض ہے کیونکہ ﴿ وفی انفسکم ﴾ معطوف ہے ﴿ وفی الارض ﴾ پر جو آیت سابقہ میں ہے ﴿ وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴾(۳) اور معنی یہ ہوئے کہ زمین میں اہل یقین کے واسطے نشانیاں ہیں اور تمہاری ذات میں بھی نشانیاں ہیں پھر کیا دیکھتے نہیں ہو۔

(۱) جس جگہ محبوب ہو وہی جگہ چاند کی مانند دیکھنے کے قابل ہے وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنویں کی تہہ میں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب ہو ہی جگہ بیٹھنے کے قابل ہے اس کے مقابلے میں پوری دنیا پر لات مارتا ہوں اے محبوب اگر تو ساتھ ہے تو دوزخ بھی جنت ہے اور تیرے بغیر تو جنت بھی دوزخ ہے (۲) رب الناس جب مل جائے تو اس سے ملنے کی کیفیت نا قابل بیان و نا قابل قیاس ہے (۳) سورۃ الذّٰریٰت:۲۱۔

غرض میرا وہ مطلب نہیں جو ان جاہلوں کا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندہ کو خاص تعلق ہوجاتا ہے۔

قرب الٰہی

اور حق تعالیٰ کو بندہ سے خاص تعلق قرب ورضا کا ہوجاتا ہے جس کی کیفیت اور حالت ہم بیان نہیں کرسکتے اور قرب کا ثبوت نصوص میں موجود ہے ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ (۱) ''اور یہ محض قرب علمی نہیں ہے کیونکہ وہ قرب مبصر نہیں (۲) جس کی مخاطب سے نفی کی گئی معلوم ہوا کہ یہ کوئی دوسرا قرب ہے جو ابصار کا متعلق ہوسکتا ہے (۳)۔

اسلام کا اثر

غرض محققین عارفین کو جو اثر اسلام کا مشاہد ہوتا ہے وہ اثر اس نومسلم کو ابھی سے حاصل ہوگیا اور یوں دیکھا گیا ہے کہ نومسلموں کو اسلام کا اثر زیادہ مشاہد ہوتا ہے گو نعمت ہمارے اوپر زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پشتہا پشت (۴) سے ہم کو مسلمان کیا ہے کیونکہ اسلام سے زیادہ مناسبت ہم کو ہی ہے نومسلم کو مناسبت دیر میں حاصل ہوگی مگر اُس کے اثر کا مشاہدہ نومسلم کو ہم سے زیادہ ہوگا۔ بھائی کے یہاں ایک کارندہ تھے حاجی عبدالرحیم جن کا اب انتقال ہوگیا ہے وہ کہتے تھے کہ ہم جب شروع شروع اسلام لائے ہوئے تھے کہ ابھی تک اس کا اظہار بھی کسی پر نہ کیا تھا اور اس وقت چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اس وقت کی نماز میں جو لطف آتا تھا وہ لطف پھر نہیں آیا بات یہ ہے کہ اس وقت دولت نئی نئی ملی تھی اس لئے زیادہ لطف تھا

(۱) ترجمہ کرنا باقی ہے (۲) وہ قرب دکھائی نہیں دیتا (۳) وہ ایسا قرب ہے جس کا مشاہدہ ہوسکتا ہے (۴) کئی پشتوں سے۔

(جیسے ذاکرین کو ابتدائے سلوک وابتدائے ذکر میں بہت ذوق وشوق ولذت و کیفیت حاصل ہوتی ہے بعد میں یہ بات نہیں رہتی مگر ذکر سے مناسبت بڑھ جاتی ہے اسی طرح نکاح میں اول اول بڑی لذت آتی ہے جو بعد میں نہیں آتی مگر مناسبت بعد ہی میں بڑھتی ہے (اور ابتداء (۱) میں گونہ اجنبیت ہوتی ہے۱۲) پس وہ انگریز لکھتا ہے کہ حقانیتِ اسلام کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے اطمینان کامل و سکون وراحت دل حاصل ہوتی ہے اسلام کے برابر کسی چیز میں دل کی راحت اور سکون وچین نہیں۔ میرا مقصود تو اس حکایت ہی سے حاصل ہوگیا کیونکہ مجھے اس وقت یہی بیان کرنا تھا کہ ازالۂ غم کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کو کامل کرلو اس طرح کہ عقائد شرعیہ کو مستحضر رکھو (۲) اور احکام شرعیہ کی پابندی کرو۔ کرکے دیکھو ان شاء اللہ راحت سے رہو گے لیکن باوجود مقصود حاصل ہوجانے کے اس وقت میں ذرا تفصیل سے اس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ اور غرض اوپر معلوم ہوچکی ہے۔

ترجمہ وربط آیت

پہلے میں آیت کا ترجمہ کردوں پھر مقصود کی تقریر کروں گا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمان وزمین کی وہی زندہ کرتے ہیں وہی مارتے ہیں اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں یہ تو ترجمہ ہوا، رہا یہ کہ اس کو ماقبل سے ربط وتعلق کیا ہے۔ سو بظاہر اس کا ربط ماقبل سے غامض ہے (۳) کیونکہ اس کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ

---

(۱) اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے لذت نفسانی کا مدار ہی اجنبیت پر ہے۱۲ جامع (۲) شرعی عقائد کو پیش نظر رکھو (۳) گہرا ہے۔

تَبَرَّاَ مِنۡهُ ؕ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ ﴾(۱) کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار کرنا صرف ایک وعدہ کی بنا پر تھا جو اس سے کرلیا تھا پھر جب یہ معلوم ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے (اور کفر ہی پر خاتمہ ہوا ہے ۱۲) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے بیزاری ظاہر کی اور اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کو رحمت وشفقت اسقدر تھی کہ اپنے ستانے والوں سے بھی شفقت ہی کا برتاؤ کرنا چاہتے تھے کہ ان کے لئے استغفار کرنے کو تیار ہوگئے تھے اور اس کا منشا یہ تھا کہ اس وقت صرف رحمت پر نظر تھی اور اللہ تعالیٰ کی سب حکمتوں پر اس قدر نظر نہ تھی جتنی بعد نزول آیات واحکام کے ہوئی۔

علوم نبوت میں تدریجا ترقی

اور اس میں کچھ نقص نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم بھی وحی سے تدریجاً بڑھتے تھے اور قبل وحی اُن کے علوم کی وہ شان نہ تھی جو بعد وحی کے ہوئی چنانچہ خود نص میں ہے ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ﴾(۲) اور ایک مقام پر ارشاد ہے ﴿وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴾(۳) اور ایک جگہ تو ایسا ارشاد ہے کہ اس کو تو ہم لوگ زبان سے کبھی نہ کہہ سکتے تھے ﴿مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَاالۡاِيۡمَانُ ﴾(۴) کہ آپ کو وحی سے پہلے کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیسی ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ نعوذ باللہ قبل از وحی حضور کا خلوعن الایمان لازم آتا ہے۔(۵) ہرگز نہیں کیونکہ آیت میں صرف علم وخبر کی نفی کی گئی ہے وجود ایمان کی نفی نہیں کی گئی اور عدم علم مستلزم عدم وجود(۶) کو نہیں ہوسکتا ہے کہ ایک

(۱) سورۂ توبہ:۱۱۴ (۲) سورۂ نساء:۱۱۳ (۳) سورۂ طٰہٰ:۱۱۴ (۴) سورۂ شوریٰ:۵۲ (۵) ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ قبل نزول وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سے خالی ہونا لازم آتا ہے (۶) کسی چیز کے علم نہ ہونے سے اسکا موجود نہ ہونا، ثابت نہیں ہوگا۔

شخص کے پاس ایک چیز ہو مگر اس کو اس کی خبر نہ ہو کہ میرے پاس یہ چیز ہے جیسے ایک شخص کو جس نے جواہرات کبھی نہیں دیکھے تھے ہیرا یا قوت کہیں سے مل جائے تو یہ بات صادق ہے کہ اس کے پاس ہیرا یا قوت ہے مگر اس کو خبر نہیں۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام میں وہ کیفیت نبوت سے پہلے بھی موجود ہوتی ہیں جسکو ایمان کہا جاتا ہے مگر نبوت سے پہلے یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کیفیت کا نام ایمان ہے بعد نبوت کے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت تو بہت بڑی نعمت ہے اسی کا نام ایمان ہے۔ غرض نبوت ووحی سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو بعض امور کا علم نہ ہونا پھر وحی سے علم حاصل ہونا نقص نہیں بلکہ عین کمال ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا کمال ہوگا کہ آپ کے علوم بلا واسطہ حق تعالیٰ کی وحی سے ماخوذ ہیں عقل وقیاس یا تعلیم بشر پر ان کی بنیاد نہیں۔

حضور ﷺ کے بشر ہونے کی حقیقت

مگر جو لوگ حضور کو نعوذ باللہ ''الٰہ'' بنانا چاہتے ہیں وہ اس بات کے ماننے کو تیار نہ ہونگے لیکن میں اُن سے کہتا ہوں کہ تم اگر آپ کو الٰہ بناؤ گے تو الٰہ ناقص بناؤ گے اور ہم آپ کو انسان کہتے ہیں مگر انسان کامل کہ حضور بشر تو ہیں مگر ایسے جیسے ایک بزرگ نے کہا ہے (بشر لا کالبشر بل هو كالياقوت بين الحجر) یعنی آپ بشر تو ہیں مگر اور آدمیوں کی طرح نہیں بلکہ ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت پتھر تو ہے مگر ایسا پتھر جس کو دیکھ کر کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ پتھر ہے اسی طرح حضور ﷺ کو دوسرے انسانوں کے ساتھ نوع یا جنس میں تو اشتراک ہے مگر صنف ایسی ممتاز ہے کہ کسی کو دھوکہ ہوسکتا ہے کہ آپ بشر نہیں کچھ اور ہیں اسی لئے بعض مغلوب العشق (۱) ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو شانِ بشریت سے ارفع ہیں (۲) چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

(۱) عشق میں ڈوبے ہوئے (۲) بلند تر ہیں۔

بمقامیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود(۱)

سجدہ علی القدم اور سجدہ للقدم میں فرق

مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ سجدہ علی القدم اور سجدہ للقدم میں فرق ہے یعنی کسی جگہ پر اس لئے نماز پڑھنا کہ حضور نے یہاں نماز پڑھی ہے یہ سجدہ علی القدم ہے یہ حرام نہیں بلکہ اتباع سنت ہے اور سجدہ للقدم یہ ہے کہ آپ کا قدم یہاں پڑا ہے اس لئے اس جگہ کو سجدہ کرو یہ حرام ہے مگر یہ شاعر غلبۂ عشق میں کہہ رہا ہے اس لئے تکفیر نہ کی جائے (نیز چونکہ اس کے کلام میں سجدہ علی القدم کے مراد ہونے کا بھی احتمال ہے گو بعید سہی اس لئے تکفیر سے احتیاط لازم ہے۱۲)

حضور ﷺ کی شانِ امتیاز

اور رسول اللہ ﷺ کا دوسروں کی مثل نہ ہونا نصوص میں مصرح ہے حضور نے تو فرمایا ہی ہے ایکم مثلی مگر قرآن میں بھی اس مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾(۲) کہ اے ازواج رسول تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو یہ حضور کی ازواج کے متعلق ارشاد ہے اور ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات کی یہ شان محض اس وجہ سے ہے کہ وہ حضور کی ازواج ہیں تو اس سے یہ بات لازم آ گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی مثل کوئی بشر نہیں حضور کی اسی شان امتیازی سے بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

ردِ اشکال

اور آیت ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ﴾ پر یہ

(۱) جس جگہ آپ ﷺ کے قدم مبارک کا نشان بھی ہو تو صاحب نظر لوگ تو سالہاسال وہاں سجدہ کرنا چاہیں گے (۲) سورۂ احزاب: ۳۲۔

اشکال نہ کیا جائے کہ﴿ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ ﴾(۱) الآیۃ اس کے معارض ہے کیونکہ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی مثل بلکہ اُن سے بہتر دوسری عورتیں ہوسکتی ہیں جبھی تو یہ ارشاد فرمایا گیا اگر رسول اللہ ﷺ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمہارے بدلہ میں تم سے بہتر عورتیں دیدیں گے جواب اس کا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت تو حضور کے نکاح میں رہنے ہی کی وجہ سے ہے اب ظاہر ہے کہ اگر حضور ان کو طلاق دیدیتے اور دوسری بیبیوں سے نکاح کرلیتے تو آپ کے نکاح کی وجہ سے اب وہ ان سے افضل ہوجاتیں بہرحال رسول اللہ ﷺ کا بے نظیر و بے مثال ہونا حدیث وقرآن دونوں سے ثابت ہے مگر اس میں اتنا غلو نہ کرو کہ حضور کو الٰہ کہو بلکہ عبد کامل کہو۔

پرندوں کی گفتگو

اور یہاں سے میں اس مسئلہ پر بھی تنبیہ کرتا ہوں کہ عشق کی تمنا نہ کرو ہاں محبت کی تمنا کرو کیونکہ عشق میں حدود کی رعایت فوت ہوجاتی ہے عاشق کی زبان بے قابو ہوجاتی ہے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں غلو کیا ہے وہ اہل عشق ہی تھے عاشق کی زبان کے بے قابو ہوجانے پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک پرندہ نے مادہ سے کہا کہ اگر تو میرا جوڑہ بن جائے تو میں تجھے سلطنت سلیمان دیدوں گا۔ حضرت سلیمان نے سن لیا اور وہ منطق الطیر (۲) کے عالم تھے اس لئے مطلب بھی سمجھ لیا فوراً بلایا اور فرمایا او گستاخ یہ کیا بدتمیزی تھی؟ اُس نے کہا حضور میں عاشق ہوں اور عاشق کی زبان بے قابو ہوتی ہے وہ عشق میں جو چاہے بکتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس جواب پر ہنس

(۱) سورۂ تحریم:۵ (۲) پرندوں کی گفتگو سمجھ سکتے تھے۔

پڑے اور اس کو چھوڑ دیا اسی طرح امید ہے کہ عشاق کو رب سلیمان بھی چھوڑ دیگا اس لئے تم ان کو برا نہ کہو ہاں ان کی تقلید بھی نہ کرو ان کی حالت کی تمنا کرو۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے علوم میں وحی سے ترقی ہوئی ہے اس لئے بعض اوقات صرف ایک پہلو پر نظر ہوئی جو داعی ہوگیا استغفار للمشرکین کی طرف (۱) اور وحی نازل ہونے سے دوسرے پہلو کی خبر ہوئی۔

تدریجاً درجہ کمال عطاء کرنے میں حکمت

اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کے علوم کو تدریجاً کیوں کامل کیا ایک دم ہی سے کامل کیوں نہ کردیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ سب علوم ایک دم سے عطا فرمادیں اور رسول اللہ ﷺ کی استعداد بھی کامل تھی پھر تاخیر کیوں ہوئی اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ کوئی حکمت ہوگی جو ہم کو معلوم نہیں دوسرا جواب اپنے واقعہ کو بیان کرکے دوں گا ایک دفعہ مجھے طریق کے متعلق کچھ پریشانی پیش آئی اور اس وقت یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہیں کہ ہمکو اسی وقت وصال عطا فرمادیں ایک مقدمہ اثبات قدرت ہوا۔ اور ان کو ہماری طلب کا حال بھی معلوم ہے خواہ ناقص ہو یا کامل مگر طلب تو ہمارے اندر ہے ہی یہ دوسرا مقدمہ ہے اور تیسرا مقدمہ ہوا اثبات علم اثبات طلب پھر وصال میں تاخیر کیوں ہے اس خیال کے بعد میں نے مثنوی بطور فال کے کھولی (میرا یہ عقیدہ نہیں کہ مولانا آکر ورق کھول جاتے ہیں بلکہ محض برکت وتسلی کے لئے اس سے فال لینے لگا اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کوئی تسلی بخش جواب ظاہر فرمادیں) تو سرورق ہی پر یہ اشعار نکلے جن میں بعینہ میرا سوال بھی مذکور تھا اور اس کا جواب بھی مسطور تھا فرماتے ہیں ؎

---

(۱) ایک پہلو پر نظر ہونے کی وجہ سے مشرکین کے لئے دعاء کی۔

چارہ می جوید پئے من درد تو　　می شنیدم دوش آہ سرد تو

یہ گویا حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہے کہ ہم تمہاری آہ سرد سن رہے ہیں اور مجھے تمہارے درد وطلب کی بھی خبر ہے اس میں اپنے علم کو اور ہماری طلب کو تسلیم کر کے دو مقدموں کو مان لیا گیا کہ یہ مقدمات صحیح ہیں ۔

می توانم من کہ بے ایں انتظار　　رہ نمایم وہم راہ گذار

اس میں تیسرے مقدمہ کو تسلیم کرلیا گیا کہ یہ صحیح ہے کہ میں اس پر قادر ہوں کہ بدوں تاخیر کے اسی وقت تم کو وصال سے سرفراز کروں ۔

تا ازیں طوفان دوراں وار ہی　　برسر گنج وصالم پانہ

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سب مقدمات تو صحیح ہیں لیکن ایک مقدمہ اور بھی اس کے ساتھ ملاؤ جو تمہاری نظر سے مخفی رہ گیا ہے وہ کیا ۔

لیک شیرینی ولذات مقر　　ہست بر اندازۂ رنج سفر
انگہ از فرزند وخویشاں برخوری　　کز غریبی رنج وزحمتہا بری

اس مقدمہ کا حاصل اثبات حکمت ہے یعنی حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ مقصود جلدی عطا نہ کیا جائے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ مستقر پر (۱) پہنچنے کی قدر زیادہ اس کو ہوتی ہے جس کو سفر میں تکلیف زیادہ ہوتی ہو اُسی کو گھر پہنچنے کی لذت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اور جس کو سفر میں کلفت ہی نہ ہوئی (۲) اس کو گھر اور باہر دونوں یکساں ہونگے تو وہ وصول الی المستقر کی قدر نہ کرے گا کیونکہ ۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص ناں دہد (۳)

(۱) منزل پر پہنچنے کی قدر (۲) تکلیف ہی نہیں ہوئی (۳) آدمی جو چیز سستی لیتا ہے سستی ہی دیدیتا ہے بچہ نان کے ایک ٹکڑے کے بدلے میں گوہر نایاب دیدیتا ہے۔

عورتوں کی عادت

ہم نے سنا ہے کہ بعض عورتیں اولاد سے گھبرا کر کہتی ہیں کہ اے اللہ کیا سارے بچے میرے ہی واسطے پھٹ پڑے اے اللہ بس اب بند کردے اور جس کے اولاد نہیں ہوئی وہ کہتی ہے کہ چاہے چوہے کا بچہ ہی ہوجائے یا ہوکر فوراً ہی مرجائے مگر میرا نام ہوجائے کہ ہاں اس کے بھی اولاد ہوئی تھی جس کے اولاد نہ ہوتی ہو اس کو تمنا کے بعد بچہ مل جائے تو اس کی بڑی قدر کرتی ہے چاہے کیسا ہی برا ہو۔

کانپور میں ایک عورت کا بچہ ایسا کالا تھا جیسے حبشی مگر اس سے اس قدر محبت تھی کہ کھلاتے ہوئے یوں کہتی تھی کہ ماشاء اللہ ایسا ہے جیسا چیونٹا اس کی سیاہی ایسی محبوب تھی کہ اس کو نظر لگ جانے کے ڈر سے ماشاء اللہ کہا کرتی تھی۔ ایک شاعر اپنے محبوب کی تعریف میں جس کے بدن پر پھٹا ہوا کرتہ تھا کہتا ہے ۔

لا تعجبوا من بلی غلالته   قد زرازراه علی القمر

اسی طرح ایک شاعر کے معشوق کے چہرہ پر چیچک کے سیاہ داغ تھے لوگوں نے ملامت کی کہ اس سے محبت کیسی؟ تو وہ اس کی تعریف میں لکھتا ہے ۔

شربت قندست دروی تخم ریحاں ریختہ (۱)

علم میں تدریجی ترقی

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ قدر اُسی نعمت کی ہوتی ہے جو مشقت سے ملے تو حکمت اسی میں ہے کہ سب علوم وحکم ایک دم سے عطا نہ ہوں بلکہ تدریجاً عطا کئے جائیں یہ جواب تھا میرے سوال کا جو مثنوی سے نکلا اور گو یہ جواب پہلے جواب کے

(۱) میرے محبوب کی مثال اس میٹھے شربت کی سی ہے جس میں تخم ریحان کے کالے بیج پڑے ہوئے ہوں۔

قریب ہی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ پہلے جواب میں کسی حکمت کا علی التعیین (۱) ذکر نہ تھا اس میں حکمت معینہ کا ذکر بھی ہے اب چاہے یہی حکمت ہو یا اور حکمتیں ہوں حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ علوم میں شیئا فشیئا تزاید ہوا کرے (۲)۔

بہر حال صحابہ کی اور رسول اللہ ﷺ کی نظر اول رحمت پر تھی حکمت پر نظر نہ تھی اس لئے آپ نے اور صحابہ نے مشرکین کے لئے استغفار کیا جب اس سے ممانعت نازل ہوئی تو حکمت پر نظر ہوئی۔

اور تزائد علوم تدریجاً میں ایک اور حکمت میری سمجھ میں ابھی آئی ہے وہ یہ کہ اگر آپ کے علوم تدریجاً متزاید نہ ہوتے (۳) بلکہ شروع ہی سے رحمت وحکمت دونوں پر نظر ہوتی تو آپ کی شفقت ورحمت کا اس درجہ ظہور نہ ہوتا جیسا کہ اب ہوا کیونکہ اُس حالت میں آپ کفار کے ساتھ رحمت وشفقت اس درجہ نہ فرماتے کہ ان کے لئے دعا کرنے لگتے اوران کی بدحالی پر رنج وافسوس کرتے حالانکہ اس میں بھی حکمت تھی کہ آپ کی اس شفقت ورحمت بے انتہا کا ظہور ہو کیونکہ اس سے بہت سے کفار پر تو یہ اثر ہوا کہ وہ اس کو دیکھ کر حضور کی نبوت کے قائل ہوگئے۔ اور ہمارے اوپر یہ اثر ہوا کہ ہم کو آپ سے بہت کچھ امیدیں ہوگئیں کہ ؎

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ بادشمناں نظر داری (۴)

ان حکمتوں کا ظہور جبھی تو ہوا کہ آپ کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا ورنہ واقعات شفقت ورحمت کا اس شان سے ظہور نہ ہوتا جس شان سے اب ہوا۔ اسی لئے ملا دو پیازہ نے اپنے (ال نامہ) (۵) میں کہا ہے۔ ''الرسول خیر خواہ دشمنان'' واقعی سچ کہا رسول کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی خیر خواہی کرتے ہیں۔

(۱) کسی حکمت کو معین کر کے نہیں بیان کیا تھا (۲) علم میں تدریجاً ترقی ہو (۳) تدریجاً نہ بڑھتے (۴) آپ دوستوں کو کب محروم رکھ سکتے ہیں جبکہ آپ دشمنوں کی بھی رعایت کرتے ہیں (۵) کتاب کا نام۔

زلات انبیاء کی حکمت

اور یہی راز ہے زلات (۱) انبیاء کا کہ اس میں بھی حکمتیں ہوتی ہیں جن میں بڑی حکمت وہی ہے کہ ان سے تزاید علوم تدریجاً (۲) ہوتا ہے سو حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے زلات موجب تنزل نہیں ہوتیں بلکہ ترقی کا سبب ہوتی ہیں (۳) ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زلت میں ترقی معرفت تھی کیونکہ ابتک آپ نے بعض صفات جمال ہی کا مشاہدہ کیا تھا صفت جلال کا جیسے منتقم اور بعض صفات جمال کا جیسے توّاب کا مشاہدہ اس زلت کے بعد ہی ہوا (۴) اور یہی ترقی ہے کہ جن صفات الٰہیہ کا مشاہدہ پہلے نہ تھا اب ہوگیا۔ غرض حکمتوں کا احاطہ کون کرسکتا ہے بطور نمونہ کے اس وقت چند باتیں بتلادی ہیں۔

سوال

اب یہاں ایک اور سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ تو مسلم ہے کہ حضور کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا اور ابتدا میں آپ کی نظر رحمت پر تھی لیکن رحمت کا ظہور اس صورت سے کیوں ہوا کہ اقرباء مشرکین کے لئے آپ نے دعا فرمائی۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال بے جا ہے (۵) کیونکہ جس صورت سے بھی ظہور ہوتا اس میں یہی سوال ہوسکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی صورت سے ظہور ہونا

---

(۱) انبیاء کی جو لغزشیں منقول ہیں ان میں یہی حکمت ہے (۲) انبیاء سے جو لغزشیں ہوتی ہیں ان سے بھی ان کو ترقی ہوتی ہے (۳) اس کے سبب ان کے علوم میں تدریجا ترقی ہوتی ہے (۴) اللہ کی صفت انتقام اور صفت توابیت کا مشاہدہ اس کے بعد ہی ہوا (۵) فضول ہے۔

چاہئے تھا جس میں ممانعت نہ ہوتی کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ اس صورت ہی میں کیا حرج ہوا یہ فعل بعد ممانعت ہی کے تو ممنوع ہوا اس سے پہلے تو مباح تھا پھر فعل مباح(۱) میں کیا حرج ہو۔

شان نبوی کی شان ابراہیمی سے مشابہت

پس یہ سوال گو بے جا ہے مگر میں تبرعاً اس کی حکمت بھی بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی شان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت ملتی جلتی ہے اسی لئے درود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے (کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا سابقین میں درجۂ صلوٰۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے لئے عطا ہوا ہے ورنہ سلام تو سب انبیاء پر ہوا ہے ﴿سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ﴾۔ ﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ﴾۔ ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ﴾۔ اور اسی مشابہت شانین کی وجہ سے حضور کی شریعت کو ملت ابراہیمیہ سے بہت مشابہت ہے اسی لئے اتباع ملت ابراہیم کا آپ کو امر ہوا(۲) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے استغفار کیا تھا حضور نے بھی ان کی اس سنت کا اتباع فرمایا، رہا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو تبری فرمادی تھی جواب اسکا یہ ہے کہ آپ کو اس تبری کی اطلاع وقت استغفار کے نہ تھی، اس اطلاع کے بعد پھر آپ نے استغفار نہیں فرمایا۔ اور قبل اس اطلاع کے آپ نے بعض اقرباء مشرکین کے لئے اقتداءً بابراہیم علیہ السلام استغفار فرمایا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس شبہ کو دفع دخل کے طور پر رفع فرمادیا ﴿وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ﴾(۳)

(۱) جائز کام (۲) آپ کو حکم ہوا (۳) سورۃ التوبہ:۱۱۴۔

کہ حضرت ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے استغفار فرمانا بوجہ وعدہ کے تھا کہ وہ باپ سے وعدہ کر چکے تھے دوسرے وہ رقیق القلب بہت تھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کردے جب تک کہ اُن کے لئے ما یتقون (۱) کو بیان نہ کردے۔

سوال

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حنفیہ کے یہاں تو توحید بدون ارسالِ رسول کے بھی واجب ہے اور اس کے ترک سے ضلال وعذاب کا وقوع ہوگا۔

جواب

جواب یہ ہے کہ یہاں پر ''یبین'' فرمایا ہے ''یوحی'' تو نہیں فرمایا اور بیان ارسال رسول پر موقوف نہیں عقل سے بھی ہوسکتا ہے پھر اس کے متعلق بعض فروع ہیں مثلاً یہ کہ کسی شخص کی عقل کامل نہ ہو اور وہ مجنون ومعتوہ (۲) بھی نہیں لیکن اس کی عقل تنہا بدوں (۳) رسول کے توحید کے پہچاننے کو کافی نہیں اس کو عذاب ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے بعض اس طرف گئے ہیں کہ ایسے شخص کو عذاب نہ ہوگا گو وہ عاقل ہے مگر قلت عقل کی وجہ سے معذور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب ہوگا۔ اور یہ مسئلہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ کے معارض نہیں کیونکہ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اس میں عذاب دنیا مراد ہے اور گفتگو عذاب آخرت میں ہے مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ نفی عذاب دنیا بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے نفی عذاب آخرت (۴) کو کیونکہ عذاب دنیا اہون ہے (۵)۔ جب بدوں بعث رسل کے

(۱) جب تک ان کو یہ نہ بتادے کہ کن کاموں سے بچنا ہے (۲) وہ دیوانہ وبدعقل بھی نہ ہو (۳) بغیر رسول کے (۴) عذاب دنیا کی نفی سے عذاب آخرت کی نفی لازم آتی ہے (۵) دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔

عذاب دنیا نہیں ہوتا تو عذاب آخرت بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔

اور جواب ثانی یہ ہے کہ یہاں رسول (۱) عام ہے عقل کو بھی اور پیغمبر کو بھی (۲)۔ یہ اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ان کے علاوہ اور بھی فروع ہیں مگر میں نے اجمالاً اشارہ کردیا ہے۔

ربط آیت

اب قابل غور یہ امر ہے کہ اس آیت کو پہلی آیت سے کیا ربط ہے بظاہر کچھ ربط نہیں معلوم ہوتا اور میں نے دیر تک غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی تفسیر دیکھی اُس میں عجیب ربط بیان کیا ہے تفسیر لکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی امداد فرمائی تھی کہ عجیب عجیب علوم قلب پر فائض ہوئے تھے تو وہاں یہ ربط لکھا ہے کہ اوپر کی آیت سے حضور ﷺ کے دل پر ایک خطرہ وارد ہوسکتا تھا کہ شاید استغفار سابق کی وجہ سے ہم سے معصیت کا صدور ہوگیا ہو ہر چند کہ اس سے پہلے استغفار للمشرک منہی عنہ (۳) نہ تھا مگر بعد نزول نہی کے یہ وسوسہ ہوسکتا ہے کہ شاید وہ پہلے ہی سے قبیح لغیرہ ہو اور صدور قبیح سے خطرہ لازم ہے (۴)۔

غلبۂ خوف وخشیت

مگر اس کو ہم اور آپ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ہم پر خوف وخشیت کا غلبہ نہیں ہے جن پر خشیت کا غلبہ ہے اُن کی یہ حالت ہے کہ ہمارے ایک دوست مولوی

(۱) قلت وهذا ايضا ضعيف فان بعث الرسول لا يطلق على اعطاء العقل فلفظ البعث آب عنه اشد الاباء والجواب ان الآية لبيان العادة الالٰهية انه تعالىٰ لا يعذب قبل البعث الرسول ولا كلام فيه وانما الكلام فى جواز التعذيب (۲) یہاں رسول کے لفظ سے نبی اور عقل دونوں مراد ہوسکتے ہیں کہ عقل بھی ہدایت کا باعث ہوتی ہے (۳) اس سے پہلے مشرک کے لئے استغفار کی ممانعت نہیں تھی (۴) ممانعت کے بعد یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس میں برائی کسی مجاور کی وجہ سے آئی ہو جس کے ہونے سے گناہ ہونے کا اندیشہ تھا۔

صادق الیقین صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے یوں نہ فرمائیں کہ تو اتنا زیادہ متقی کیوں تھا اور لوگ تو قلت تقویٰ سے ڈرتے ہیں ان کو زیادت تقویٰ سے خطرہ تھا (۱) اس کو ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر بات فی نفسہ صحیح ہے کیونکہ شریعت میں ہر شے کی حد ہے تقویٰ کی بھی ایک حد ہے۔ اطاعت کی بھی ایک حد ہے۔ خاطر ومدارات کی بھی ایک حد ہے۔

زیادتی از حدود

چنانچہ ایک شخص نے اپنے مہمان سے پوچھا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں اُس نے پھر پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں اُس نے بار بار اسی بات کی رٹ لگائی کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ مہمان نے کہا کہ اب تک تو کوئی تکلیف نہ تھی مگر اب ہے۔ واقعی کسی سے ایک ہی بات دس دفعہ کہی جائے تو وہ گھبرا جائیگا۔

انوکھا فیصلہ

جیسا کہ غدر کے قبل ہمارے قصبہ میں ایک مجلس بڑارہ کے نام سے قصبہ کے لڑکوں اور شودوں نے قائم کی تھی۔ جس کا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ بستی میں جو واقعات ومعاملات پیش آئیں ان کا انتظام کیا جائے چنانچہ اس مجلس میں بہت سے معاملات کا فیصلہ بھی ہوا کرتا تھا اس مجلس کے بعض عہدہ داروں کو میں نے بھی دیکھا ہے کوئی لفٹنٹ گورنر تھا کوئی کلکٹر کوئی ڈپٹی کلکٹر کوئی جج کوئی صدر اعلیٰ۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں قصبہ کے اندر باہر سے کوئی میانجی آگئے جو فارسی اچھی جانتے تھے بستی کے میانجی کو ان سے خطرہ پیدا ہوا کہ شاید میری جگہ ان کو نہ مل جائے اس لئے اُس نے اس مجلس میں باضابطہ درخواست دی کہ بستی میں ایک نیا میانجی آگیا ہے جس کی

(۱) اور لوگ تو تقویٰ کی کمی سے خوف زدہ تھے وہ تقویٰ کی زیادتی سے ڈر رہے تھے۔

وجہ سے مجھے اپنی روزی کا خطرہ ہے اس کے لئے مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ مسئلہ کمیٹی میں پیش ہوا اور فیصلہ کر دیا گیا کہ اس نووارد کو شہر سے نکالدیا جائے۔ اور ایک لڑکے کو متعین کیا گیا کہ اس کام کو تم انجام دو۔ چنانچہ اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ آج صبح کو سویرے کھانا پکا دینا میں ایک کام کو جاؤں گا پھر صبح ہی کھانا ساتھ لیکر اُس مسجد میں جا پہنچا جہاں وہ میانجی نماز پڑھتے تھے جب وہ مسجد سے باہر آنے لگے ان کو سلام کیا انہوں نے جواب دیا تھوڑی دیر میں سامنے جاکر پھر سلام کیا انہوں نے پھر جواب دے دیا اس کے بعد پھر سلام کیا تو میانجی جھلاّ گئے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے اب یہ دل میں خوش ہوئے کہ ہاں بس اب کام مارلیا۔ اس نے کہا حضور میں سلام ہی تو کر رہا ہوں گالیاں تو نہیں دیتا پھر آپ جھلاتے کیوں ہیں میرے سلام کا جواب دیجئے اُنہوں نے پھر جواب دیا اور اس نے پھر سلام کیا آخر میانجی گھبرا کر اپنے جائے قیام میں جانے لگے اُس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو میرے سلام کا جواب دو۔ حافظ صاحب بولے میاں مجھے اپنے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ کہا اس سے بے فکر رہئے میرے پاس کھانا بہت ہے دونوں کھالیں گے بس آپ یہیں تشریف رکھیں اور میرے سلام کا جواب دیتے رہیں دونوں نیک کام میں مشغول رہیں گے۔ غرض سلام ہی سے ان کو پریشان کر دیا اب ان کو سوا اس کے کچھ نہ سوجھا کہ اپنا بستر سمیٹ کر قصبہ سے چلدیئے تو دیکھئے سلام اچھی چیز ہے اور راحت وخوشی کی چیز ہے مگر جب حد سے بڑھ جائے تو عذاب و کلفت کا سبب ہو جاتا ہے۔

ہم زاد کا علاج

اسی طرح ایک شخص نے ہمزاد کو تابع کیا تھا اُس نے اول ہی حاضری میں

پوچھا کہ بتلاؤ کیا کام ہے اس نے ایک کام بتلا دیا اُس کو پورا کر کے پھر آموجود ہوا کہ اور کیا کام ہے اس نے دوسرا کام بتلا دیا۔ اس کو ختم کر کے پھر پوچھا بتلاؤ کیا کام ہے اگر یہ سوتا ہوا ہوتو جگا کر پوچھتا بتلاؤ کیا کام ہے۔ یہ بڑا پریشان ہوا کہ کیا بلا پیچھے لگی مگر تھا ہوشیار آدمی اس نے اپنے مکان کے صحن میں ایک بلی گاڑ دی(۱) جب کوئی کام نہ ہوتا اور وہ پوچھتا کہ بتلاؤ کیا کام ہے تو کہہ دیتا کہ اس بانس پر چڑھو اور اترو یہی کام کرتے رہو جب تک کہ ہم دوسرا کام بتلائیں۔ تو اطاعت کی بھی ایک حد ہے جب اُس سے تجاوز ہو جائے تو وہ اطاعت باقی نہیں رہتی۔

تقویٰ میں غلو کی مثال

اسی کو مولوی صادق الیقین صاحب سمجھے صوفیہ اور فقہاء نے بھی اس کو سمجھا ہے اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص گیہوں کے ایک دانہ کی تعریف وتشہیر(۲) کرے اس کو تعزیر کی جائے (یعنی سزا دی جائے) اس کا منشا وہی ہے کہ یہ شخص ورع وتقویٰ میں غلو کرتا ہے۔ اور غلو فی التقویٰ اس لئے منہی عنہ ہے کہ یہ شخص دین میں اضافہ کرتا ہے(۳) کہ تقویٰ کے لئے ان امور کی بھی ضرورت ہے جن کی میں رعایت کرتا ہوں حالانکہ شریعت نے ان کی رعایت نہیں کی اور دین میں اضافہ کرنا بدعت ہے اور بدعت سخت جرم ہے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تعزیرات ہند(۴) میں ایک قانون کا اضافہ کر دے گو وہ قانون سلطنت کی اغراض کے لئے مفید ہی ہو مثلاً کوئی یہ قانون بڑھا دے کہ روزانہ کلکٹر کو سلام کرنا ضروری ہے ورنہ دس روپے جرمانہ ہوگا تو یہ قانون کوئی باغیانہ نہیں بلکہ اس کا

---

(۱) ایک لمبا سا بانس زمین میں لگا دیا (۲) یعنی یہ اعلان کرتا پھرے کہ یہ دانہ گندم کس کا ہے (۳) تقویٰ میں حد سے بڑھنا اس لئے منع ہے کہ یہ دین میں زیادتی ہے (۴) ہندوستانی قانون میں۔

منشا تعظیم حکام ہے جو ظاہر میں مستحسن ہے مگر کوئی تعزیرات ہند میں اس قانون کا اضافہ کر کے تو دیکھے فوراً جرم قائم ہو کر سزا ہو جائیگی اور اس کا راز یہ ہے کہ یہ شخص اپنے کو امور سلطنت میں دخیل سمجھتا ہے کہ میں بھی جماعتِ قانون ساز کا ایک فرد ہوں۔

فاتحہ اور میلاد منانے کا رد

اسی طرح جو شخص احداث فی الدین[۱] کرتا ہے وہ در پردہ مدعی نبوت کا ہے کہ مجھے بھی شریعت میں اضافہ کرنے کا اختیار ہے نیز در پردہ شریعت پر نقص کا الزام لگاتا ہے کہ ابھی شریعت مکمل نہیں بلکہ میرے اضافہ کی ضرورت ہے اور اس کا سخت جرم ہونا ظاہر ہے۔ اب لوگ اس راز کو تو سمجھتے نہیں خواہ مخواہ علماء سے جھگڑتے ہیں کہ فاتحہ اور مولود میں کیا خرابی ہے یہ تو اچھا کام ہے پھر اس سے کیوں منع کرتے ہو۔ اس کا حقیقی جواب یہی ہے کہ جن قیود کے ساتھ تم ان افعال میں ثواب کے قائل ہو شریعت نے ان قیود پر ثواب نہیں بیان کیا مگر عوام اس کو کیا سمجھیں اس لئے میں ان لوگوں سے الزامی گفتگو کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ گاؤں میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا بس خاموش ہو گئے اسی طرح ایک گاؤں والے نے مجھ سے پوچھا کہ فاتحہ دینا کیسا ہے میں نے کہا میاں تم نے کبھی لکڑیاں بھی اللہ واسطے دی ہیں کہا جی ہاں میں نے کہا تم نے کپڑا بھی کبھی دیا ہے کہاں ہاں میں نے کہا پھر اس پر بھی فاتحہ پڑھی تھی، کہا نہیں۔ میں نے کہا پھر کھانے ہی پر فاتحہ

---

(۱) دین میں نئی بات پیدا کرتا ہے۔

کیوں پڑھتے ہو۔ تو وہ گاؤں والا کہنے لگا کہ جی ہاں بس یہ تو فضول سی بات ہے۔ میں نے کہا ہاں خود سمجھ لو۔ اگر ثواب ہی پہنچانا ہے تو فاتحہ الگ پڑھ دو کھانا الگ دیدو۔ دونوں میں جوڑ لگانے کی کیا ضرورت یہ گاؤں والے سمجھنے کے بعد حجتیں نہیں نکالتے کیونکہ ان کی طبائع میں سلامتی ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک صاحب نے فاتحہ کے متعلق مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہا کہ آپ پوری دیگ پر فاتحہ کیوں نہیں پڑھتے پلاؤ کی دیگ میں صرف ایک طباق میں کھانا رکھ کر اُسی پر کیوں پڑھتے ہو کیا اللہ تعالیٰ کو نمونہ دکھلاتے ہو۔ اور ایک شخص کو میں نے یہ جواب دیا کہ بتلاؤ ثواب پہنچتا ہے پکانے کا یا کھلانے کا کہا ثواب تو کھلانے کا ہوتا ہے میں نے کہا پھر کھلانے کے بعد فاتحہ پڑھ دینا اور ثواب پہنچا دینا یہ چند نمونے میں نے بتلا دیئے ہیں کہ اہلِ بدعت کو الزامی جواب اس طرح دینا چاہئے کیونکہ وہ حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے یا سمجھ نہیں سکتے ہاں اگر کوئی فہیم ہو تو اس کو حقیقت بھی بتلا دیجائے۔

قیام مدارس وایجادات بدعت نہیں

ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ احداث فی الدین اور شے ہے اور احداث للدین اور شے ہے یعنی ایک تو یہ صورت ہے کہ نئی بات کو دین میں داخل کیا جائے۔ یہ تو بدعت محرمہ ہے(۱) ایک یہ صورت ہے کہ نئی بات دین کی حفاظت وغیرہ کے لئے ایجاد کی جائے(۲) جیسے ہر زمانہ میں اسلحہ نئے نئے ایجاد ہوتے رہتے ہیں کیونکہ پرانے اسلحہ آجکل کارآمد نہیں۔ یا دین کی حفاظت کے لئے مدارس وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں یہ بدعت نہیں کیونکہ ان کو دین میں داخل کر کے جزو دین نہیں بنایا گیا بخلاف مولود وفاتحہ وغیرہ کے کہ ان کو دین میں داخل کیا جاتا

(۱) یہ تو بدعت ہے اور حرام ہے اسی کو احداث فی الدین کہتے ہیں (۲) اسی کو احداث للدین کہتے ہیں۔

اور دین کا جزو سمجھا جاتا ہے یہ سب بدعات ہیں خوب سمجھ لو۔

رفع شبہہ

بہرحال! جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا کہ شدید الخوف (۱) کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید فعل حسن بھی قابل گرفت ہوجائے (۲) تو رسول اللہ ﷺ کو نہی عن الاستغفار کا حکم سن کر یہ وسوسہ ہوتا کہ شاید یہ ہمارا استغفار نزول نص سے پہلے بھی قبیح ہو اور ہم سے معصیت کا صدور ہوا ہو (۳) قبیح لنفسہ ہونے کا تو احتمال نہ تھا (۴) کیونکہ آپ ﷺ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا صدور ہو چکا ہے ہاں قبیح لغیرہ ہونے کا احتمال (۵) ہوسکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس شبہ کو رفع فرمادیا خواہ یہ شبہ واقع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کیونکہ قرآن اُن شبہات کو بھی رفع کر دیتا ہے جن کا وقوع محتمل ومظنون ہے (۶) اور اس قسم کا شبہ تحویل قبلہ اور تحریم خمر کے وقت واقع بھی ہو چکا ہے جس وقت تحویل قبلہ کا حکم وارد ہوا تو بعض صحابہ کو احتمال ہوا کہ شاید ہماری وہ نمازیں ناقص ہوئیں جو بیت المقدس کا استقبال کر کے پڑھی گئیں اس پر آیت ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ نازل ہوئی اور تحریم خمر (۷) کے وقت صحابہ کو شبہ ہوا کہ ہمارے جو بھائی اس سے پہلے شراب پیتے ہوئے مرگئے ہیں شاید ان کی حالت ناقص رہی اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّأَحْسَنُوا ط

---

(۱) جس پر خوف کا غلبہ ہو (۲) شاید اچھا فعل بھی مذمت کے قابل ہو (۳) استغفار کی ممانعت سن کر یہ خیال ہوسکتا تھا شاید اس ممانعت کے نازل ہونے سے پہلے بھی استغفار کرنا بُرا ہو اور ہم سے گناہ سرزد ہو گیا ہو (۴) اپنی ذات کے اعتبار سے برا ہونے کا احتمال (۵) ہاں غیر کے اعتبار سے برائی کا احتمال تھا (۶) واقع ہونے کا احتمال وگمان ہو (۷) حرمت شراب کے وقت۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾(۱) تو کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو یا صحابہ کو استغفار للمشرکین کے متعلق بھی یہ خلجان (۲) ہوتا کہ شاید ہمارا استغفار قبل النہی قبیح لغیرہ ہو گیا ہو کسی عارض کی وجہ سے اور منجملہ عوارض کے تعدی عن الحدود بھی ہے (۳)۔

رعایت حدود

کیونکہ ہر شے کے لئے ایک حد ہے افعال مباحہ (۴) کے لئے بھی ایک حد ہے اعمال مستحبہ کی بھی ایک حد ہے اور یہاں سے ایک اور اشکال مرتفع ہوا وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن دو نابالغ لڑکیاں رسول اللہ ﷺ کے سامنے گا رہی تھیں حدیث میں اس کے ساتھ ہی یہ بھی آتا ہے ولیستا بمغنیتین کہ وہ گانے والی نہ تھیں یعنی ان کو باقاعدہ گانا نہیں آتا تھا یوں ہی بے قاعدہ محض خوشی کے طور پر گا رہی تھیں پس اس سے مطلق غنا کے جواز پر استدلال نہیں ہوسکتا غرض حدیث میں آتا ہے کہ وہ لڑکیاں گا رہی تھیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے جب بھی وہ گاتی رہیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں اور گانا بند کر دیا رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبسم فرمایا اور فرمایا اے عمر رضی اللہ عنہ شیطان تم سے بھاگتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم ایک راستہ کو چلو گے تو شیطان اس راستہ کا چلنا چھوڑ دیگا۔ اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ غنا حرام تھا تو خود رسول اللہ ﷺ نے کیوں نہ منع فرمایا اور جائز تھا تو آپ نے ان کے قطع غنا پر یہ کیوں فرمایا کہ شیطان عمر رضی اللہ عنہ سے بھاگتا ہے اس کا بھی جواب اسی قاعدہ سے نکلتا ہے کہ ہر شے کی حد ہے مباح کی بھی ایک حد ہے اور یہ غنا حد مباح کے اندر تھا مگر اس وقت مباح کی حد ختم ہوچکی تھی کہ حضرت عمر اتفاقاً تشریف لے آئے اور ان کو دیکھتے ہی گانے والیاں

(۱) سورہ مائدہ: ۹۳ (۲) یہی تردد ہوتا (۳) ان عوارضات میں سے ایک حد سے تجاوز کرنا بھی ہے (۴) جائز افعال کے لئے۔

خاموش ہوگئیں اگر وہ خاموش نہ ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ خود منع فرمادیتے مگر حضور کو تعجب وتبسم اس پر ہوا کہ حضرت عمر کی صورت دیکھتے ہی بدوں (۱) ان کے کچھ کہے۔ گانے والیاں خود ہی چپ ہوگئیں اس پر حضور نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ شیطان تم سے بھاگتا ہے (اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غنا اس وقت حد مباح پر تھا مگر یہ ایسا مباح ہے جس کو شیطان اپنی کامیابی کا وسیلہ بنایا کرتا ہے کما فی الحدیث "والشعر من مزامیر ابلیس" (۲) اور حضرت عمر کا رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے ایسا مباح بھی واقع نہ ہوسکتا تھا جس میں شیطان کا کچھ بھی حصہ ہو(ویجوز مثل هذالمباح بحضرة الرسول ﷺ لكونه شارعاً محدد الحدود المباح والحرام ونحوهما ۲۲)(۳)

حاکمانہ جواب

اس کے بعد ارشاد ہے ﴿ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ بے شک اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس جگہ یہ سوال ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو استغفار للمشرکین (۴) سے کیوں منع فرمایا بلکہ یوں ہوتا کہ وہ استغفار کرتے رہتے پھر اللہ تعالیٰ چاہے اس کو قبول کرتے یا نہ کرتے اور مشرکین کو بخشتے یا نہ بخشتے اس سوال کا جواب اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں دیا گیا ہے اور جواب حاکمانہ ہے کہ ہماری سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں اس لئے ہم کو حق ہے کہ تم کو استغفار سے روکدیں۔ قرآن میں زیادہ تر حاکمانہ ہی جواب دیئے گئے ہیں چنانچہ شیطان سے جب انکار سجدہ کی وجہ پوچھی گئی اور اس نے جواب دیا ﴿ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ج خَلَقْتَنِیْ

(۱) بغیر ان کے کہے (۲) جیسا کہ حدیث میں ہے کہ شعر شیطان کے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار ہے (۳) حضور ﷺ کے روبرو ایسے مباح کے ارتکاب کی اجازت تھی کیونکہ آپ ﷺ جائز و ناجائز کی حد بیان کرنے والے تھے (۴) مشرکین کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے کیوں منع کیا۔

مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ تو اس کی اس دلیل کا حاکمانہ ہی جواب دیا گیا ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (۱)

اسی طرح مقبولین کو بھی حاکمانہ جواب دیا گیا ہے۔

یعنی فرشتوں کو جبکہ انہوں نے آدم علیہ السلام کی خلافت پر سوال کیا تو فرمایا ﴿اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔

قرآن کی خوبی

اور یہی تو قرآن کی خاص بات ہے جس سے اس کا کلام الٰہی اور شاہانہ کلام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ہر سوال کا حکیمانہ ہی جواب دیا جاتا تو شاہانہ کلام نہ معلوم ہوتا بلکہ فلسفی کا کلام معلوم ہوتا اس لئے حکیمانہ جوابات کم دیئے گئے ہیں اور اگر دیئے بھی ہیں تو حاکمانہ جواب کے ساتھ دیئے ہیں مگر افسوس طلبہ مصنّفین کی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس میں بھی وہی طرز ڈھونڈتے ہیں اس لئے ان کو قرآن کا پورا لطف نہیں آتا ورنہ عجیب پر لطف کلام ہے پس ﴿اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ میں اس شبہ کا حاکمانہ جواب دیا گیا ہے۔

حکیمانہ جواب

اور حکیمانہ جواب تبرعاً میں بیان کرتا ہوں گو ہمارے ذمہ تو نہیں وہ یہ کہ کفار سے بغض وعداوت رکھنے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ محبت الٰہیہ کا حق یہ ہے کہ اعداء اللہ سے عداوت وبغض رکھا جائے (۲) دوسرے اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر بغض فی اللہ ہی سے ہوئی ہے۔ اگر مشرکین کے لئے استغفار جائز ہوتا تو اس بغض میں کمی ہوجاتی کفار پر جوش وغضب نہ رہتا اس حکیمانہ جواب کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہوگا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

(۱) سورۂ حجر: ۳۵ (۲) اللہ کے دشمنوں سے بغض ودشمنی رکھے۔

﴿وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ میرے خیال میں اس کا ربط ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ﴾ سے بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ جملہ آیت سابقہ کے مضمون کی دلیل ہے کہ تم کو قبل نہی کے استغفار کرنے سے گناہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست و مددگار نہیں ہے اور یہ بات محبت و ولایت کے خلاف ہے کہ نہی سے پہلے کسی فعل کے ارتکاب پر عذاب کیا جائے یا گناہ کی فرد جرم قائم کی جائے نیز اس میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو کسی کے گھمنڈ پر مناہی[1] کا ارتکاب کرتے ہیں ہم فلاں کی شفاعت یا استغفار سے بچ جائیں گے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار اور دوست نہیں اس لئے کسی دوسرے کے بھروسہ اور گھمنڈ پر گناہوں کا ارتکاب نہ کرنا۔

اجازت سفارش

مگر اس سے شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ شفاعت تو خدا تعالیٰ کے اذن[2] سے ہوگی ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ تو اجازت اُسی شخص کے متعلق ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ خود بخشنا چاہیں گے اور جس کی ولایت و نصرت وہ نہ چاہیں گے اس کے لئے اذنِ شفاعت ہی کیوں دیں گے۔

ممانعت استغفار کی وجہ

نیز اس آیت میں اُس شبہ کا حکیمانہ جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اور مسلمانوں کو استغفار للمشرکین[3] سے کیوں منع فرمایا بلکہ ان کو استغفار کرنے دیتے اور خود استغفار کو قبول کرتے یا نہ کرتے اس کا حکیمانہ جواب اس طرح دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست و مددگار نہیں پس تم بھی دوستی اُسی سے کرو جو

(۱) کسی کے بھروسہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں (۲) خدا کی اجازت سے (۳) مشرکین کے لئے دعائے مغفرت کی ممانعت کی وجہ۔

خدا کا دوست ہو اور جو خدا کا دشمن ہو اُس سے دشمنی کرو پس کفار سے دوستی نہ کرو اور استغفار بھی اسی کی فرد ہے اس لئے کفار کے واسطے استغفار ہرگز نہ کرو کیونکہ وہ اعداء اللہ ہیں(۱) تم بھی اُن سے عداوت ظاہر کرو۔ غرض یہاں تین مضمون تھے یعنی نہی عن الاستغفار بحیثیت حاکمیت و نہی عن الاستغفار بحیثیت حکمت و عدم تاثیم قبل النہی (۲) تینوں پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

تفسیر آیت

اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں ﴿ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ سے یہ ثابت ہوا کہ احکام تشریعیہ کے مقرر کرنے کا حق تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کیونکہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور اسی سے دوسرا مقدمہ یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو احکام تکوینیہ کے مقرر کرنے کا بھی پورا اختیار ہے کیونکہ ﴿ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہر قسم کے احکام کو عام ہے تشریعیہ کو بھی اور تکوینیہ کو بھی مگر شاید کوئی عموم کو تسلیم نہ کرے کیونکہ عموم و خصوص (۳) کا سمجھنا مجتہد ہی کا کام ہے مگر اس آیت میں ایک جملہ ایسا موجود ہے جس سے آیت کا عموم واضح ہوگیا اور وہ یحیي ویمیت ہے کیونکہ احیاء و اماتت تو احکام تکوینیہ ہی سے ہیں (۴) ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے۔ تو یحیي ویمیت میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو سلطنت کی وجہ سے عالم میں نافذ کئے جاتے ہیں اور یہ تصرف احکام تکوینیہ سے ہے اس لئے آیت دونوں قسم کے احکام کو عام ہوگئی سباق میں احکام تشریعیہ کا ذکر تھا سیاق میں (۵) تکوینیہ کا ذکر ہوگیا تو ہر

(۱) اللہ کے دشمن (۲) ممانعت استغفار بحیثیت حاکمیت و حکمت اور ممانعت کے حکم کے نزول سے قبل طلب استغفار پر گناہ نہ ہونے کو بیان کیا (۳) اس بات کو سمجھنا کہ یہ حکم عام ہے یا خاص ہے مجتہد کا کام ہے (۴) زندہ کرنا اور مارنا تکوینی حکم ہے (۵) پہلے احکام شرعی کو بیان کیا پھر احکام تکوینی کو۔

طرف سے جکڑ (۱) بند کر دیا گیا خصوص کا احتمال نہیں رہا یہ تو آیت کی تفسیر تھی۔

تمہید مقصود ہے

ابھی میں نے مقصود کو شروع نہیں کیا تمہید بہت لمبی ہوگئی مگر مقصود مختصر ہوگا کیونکہ تمہید تو عموماً لمبی ہی ہوتی ہے دیکھئے کھیت میں گیہوں ڈالنا ہل جوتنا پانی دینا کاٹنا یہ کتنا لمبا کام ہے اور اس کے بعد آٹا پیسنا گوندھنا آگ جلانا روٹی پکانا یہ بھی تمہید ہی ہے۔ اور لقمہ بنا کر کھالینا کتنا مختصر کام ہے اور مختصر محض لفظوں ہی میں نہیں کہ میں نے تلفظ میں اس کو مختصر کر دیا ہو جیسے یہاں ایک شاعر تھے جن کے اشعار میں ایک مصرع لمبا اور ایک چھوٹا ہوتا تھا کسی نے ان پر اعتراض کیا تو آپ نے دعویٰ کیا کہ مولانا جامی کے کلام میں بھی تو ایسا ہی واقع ہے پوچھا کہاں تو آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

الٰہی غنچہ امید بکشا (۲)

اس مصرع کو تو خوب کھینچ تان کر پڑھا پھر جلدی سے کہدیا ؎

گلے از روضۂ جاوید بنما (۳)

تو جیسے اس شخص نے تلفظ میں دوسرے مصرع کو مختصر کر دیا تھا میں کھانے کو اس طرح مختصر نہیں کہتا بلکہ وہ واقع میں مختصر ہی ہے سب سے زیادہ دیر کھانے میں انگریز کرتے ہیں کہ بہت آہستہ آہستہ کھاتے ہیں اور دنیا بھر کی باتیں اسی وقت کرتے ہیں مگر پھر بھی بہت سے بہت ایک دو گھنٹہ میں کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں سو یہ بھی تمہید کے سامنے تو مختصر ہی ہے۔

کھانا کھانے والے کو سلام کرنے کی ممانعت کی وجہ

اور دیکھئے انگریز وقت کی قدر کے بھی مدعی ہیں مگر کھانے میں اتنا وقت صرف کرتے ہیں کہ جس کی حد نہیں بعض لوگ اس میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ

(۱) مکمل طور پر حد بندی کر دی گئی (۲) یا اللہ میری امید کی کلی کو کھلا دے (۳) کامیابی کے باغ کا پھول عطا فرما۔

انسان کے لئے تفریح اور جی بہلانے کے لئے بھی تو کچھ وقت چاہئے انہوں نے اس کے لئے کھانے کا وقت رکھا ہے تا کہ ایک وقت میں دو کام ہو جائیں ۔

چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دوکار(۱)

مگر اسمیں خرابی یہ ہے کہ جی بہلانے میں بعض دفعہ ہنسی بھی آ جاتی ہے اور کھانے کے وقت ہنسی آنے سے بعض دفعہ گلے میں پھندا لگ جاتا ہے ہمارے فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو سلام کرنا مکروہ ہے کیونکہ فطری بات یہ ہے کہ سلام کو سنکر سننے والے کے دل پر جواب کا تقاضا ہوتا ہے (کیونکہ جواب سلام واجب ہے) اور ممکن ہے کہ اس وقت لقمہ گلے کے بیچ ہی میں ہو تو تقاضائے جواب سے پھندا لگ جانے کا خطرہ ہے یہ علت میری سمجھ میں بھی بہت دنوں کے بعد آئی پہلے میں بھی سوچتا تھا کہ فقہاء نے اس وقت سلام کو کیوں مکروہ کہا عرصہ کے بعد یہ علت سمجھ میں آئی اور اس وقت فقہاء کی قدر ہوئی کہ واقعی یہ حضرات امت کے لئے رحمت ہیں غرض کھانے کے وقت میں تقاضے کا کام نہ کیا جائے۔

غم وفکر کا علاج

اب میں مقصود عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تمام غموم وافکار کا علاج بتلایا ہے کیونکہ فرماتے ہیں ﴿ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے سلطنت ہے تمام آسمانوں کی اور زمینوں کی یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر طرح تصرف کا حق ہے تم کو کسی تجویز کا کوئی حق نہیں تو اس آیت میں ہم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم کو تشریعیات وتکوینیات کے متعلق کوئی تجویز اپنی طرف سے نہ کرنا چاہئے اور غور کر کے دیکھا جائے تو تمام غموم کا مدار تجویز (۲) پر ہے کہ ہم لوگ اپنی طرف سے اپنے معاملات کے متعلق ایک تجویز قائم کر لیتے ہیں کہ یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے۔

(۱) کیا ہی اچھا ہو کہ ایک تدبیر سے دو کام نکل جائیں (۲) غم کی بنیاد۔

شیخ چلی کی حکایت

جیسے شیخ چلی کا واقعہ ہے کہ وہ دو پیسہ کی مزدوری پر ایک شخص کا تیل کا گھڑا لیکر چلا اور راستہ میں سوچنا شروع کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لوں گا ان کو کسی کی مرغی کے نیچے رکھوں گا ان میں سے ایک مرغی نکلے گی اور ایک مرغا پھر دونوں کے بہت سے بچے ہوں گے ان سب کو بیچ کر بکریاں لوں گا پھر ان کے بہت بچے ہوں گے کہ جنگل بھر جائیگا ان سب کو بیچ کر گائے بھینس خریدوں گا ان کے بہت سے بچے ہوں گے ان سب کو بیچ کر اونٹوں کی پھر ہاتھی کی تجارت کروں گا پھر میں بڑا تاجر اور مالدار ہوجاؤں گا پھر بڑا سا مکان بناؤں گا اور وزیرزادی یا بادشاہ زادی کو نکاح کا پیغام دوں گا وہ فوراً میرے مال و دولت کو دیکھ کر پیغام منظور کرلیں گے اور نکاح ہوجائیگا پھر اولاد ہوگی اور بچہ بڑا ہوگا تو مجھ سے پیسے مانگے گا میں کہوں گا ہشت اس کہنے کے ساتھ آپ کا سر ہلا گھڑا گر کر ٹوٹ گیا تیل والے نے کہا ابے یہ کیا کیا۔ کہا میاں جاؤ تمہارے تو دو روپیہ کا تیل ہی گیا میرا تو سارا خاندان برباد ہوگیا۔

رنج وغم کی بنیاد

تو دیکھئے اس تجویز کی کوئی حد ہے ہم لوگ اس قصہ پر تو ہنستے ہیں مگر افسوس اپنے حال پر نہیں ہنستے کہ ہم سب ایسی حماقت میں گرفتار ہیں کہ ہر وقت خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں جن میں اکثر تو ناکامی ہی ہوتی ہے اور یہی جڑ ہے رنج کی اور اگر کامیابی بھی ہوجائے تو وہ کامیابی بھی ہزاروں ناکامیوں کو اپنی آغوش(۱) میں لئے ہوتی ہے چنانچہ اگر اس شخص کی تجویز کا وقوع ہوجاتا تو انجام یہ ہوتا کہ یہ ایک شخص تو امیر ہوجاتا مگر اسی کے ساتھ بہت سے غریب برباد ہی ہوجاتے چنانچہ شب و روز یہی حالت دیکھی جاتی ہے کہ ایک شخص امیر ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے دس غریب

(۱) پہلو میں۔

ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے آدمیوں کے غریب ہونے کے بعد ایک آدمی امیر بنتا ہے۔

دنیا کی حالت

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص گاؤں کا رہنے والا کہیں پردیس میں جا کر پانچ سو روپے کا نوکر ہو گیا اس نے اپنی ترقی کی اطلاع گھر پر بھیجی تو سارے گاؤں میں خط کا پڑھنے والا صرف ایک میانجی تھا(۱) جو اس شخص کے مکان پر بچوں کو پڑھاتا تھا گھر پر خط پڑھنے کے لئے اس کو بلایا گیا تو وہ خط دیکھ کر رونے لگا۔ بیوی نے کہا میانجی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا بتلاؤں گا مگر پہلے تو بھی رو۔ وہ رونے لگی اس شور وغل کو سن کر محلّہ والے جمع ہو گئے سب نے پوچھا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو میانجی نے کہا بتلاؤں گا تم بھی روؤ۔ وہ سب بھی رونے لگے آخر کہا گیا میاں خط تو سناؤ یہ تو معلوم ہو کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ کہا اس میں یہ لکھا ہے کہ میری ترقی ہو گئی اور میں پانچ سو روپے کا ملازم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کمبخت پھر یہ بات رونے کی ہے یا خوشی کی۔ میانجی نے کہا یہ بات رونے ہی کی ہے میرے لئے تو اس واسطے کہ اب وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیگا جس کے لئے میں کافی نہیں اس لئے مجھ کو ملازمت سے جدا کر دیگا کوئی انگریزی داں ماسٹر بچوں کے واسطے بلایا جائیگا اور بیوی کے لئے اس واسطے کہ اب وہ اتنے بڑے عہدہ پر پہنچ کر اس گاؤں کی دیہاتن پر کیوں کفایت کریگا۔ اب وہ کسی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کرے گا اور تمہارے لئے اس واسطے کہ اب وہ ہزاروں روپے کما کر لائیگا اور اپنا مکان عالیشان بنانے کی فکر کریگا اور محلّہ کے غریب آدمیوں کے مکانات خرید کر کسی کے مکان کو اصطبل بنائے گا کسی کو بیٹھک کسی کو کچھ کسی کو کچھ ممکن ہے یہ حکایت کسی نے گھڑی ہو مگر دنیا کی حالت ہے یہی جو اس حکایت میں ظاہر کی گئی۔

---

(۱) قرآن پڑھانے والا استاد۔

تخفیف مصیبت پر حکایت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمام کلفتوں کا مدار تجویز پر ہے اگر اس کو قطع کر دیا جائے تو پھر کوئی کلفت نہیں کسی رنجیدہ واقعہ پیش آنے سے کلفت اس لئے ہوتی ہے کہ ہم نے اس کا خلاف ذہن میں تجویز کر رکھا تھا اور اگر انسان پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہے بلکہ اُس سے زائد کے لئے بھی آمادہ رہے تو پھر کچھ بھی کلفت نہیں۔

جیسے ایک شخص کی حکایت ہے جس کا لقب مرزا ''لیمو'' تھا کیونکہ اس کا معمول یہ تھا کہ ایک لیموں ساتھ لیکر سرائے میں چلا جاتا۔ اور جب کسی متمول(۱) مسافر کو دیکھتا کہ کھانا کھانے بیٹھا ہے تو جیب سے لیموں نکال کر سالن میں ذرا سانچوڑ دیتا کہ لیجئے اس سے کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ پھر اکثر تو ایسا ہوتا کہ کھانے والا خود ہی اس کی تواضع کرتا کہ آپ بھی کھا لیجئے اور اگر وہ تواضع نہ کرتا تو یہ خود کھانے میں شریک ہوجاتے۔ پھر دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا عرفاً معیوب ہے اس لئے کوئی کچھ نہ کہتا اور یہ اسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتے مگر سب آدمی یکساں نہیں ہیں ایک شخص کے ساتھ اس نے ایسی ہی حرکت کی کہ بدون کہے کھانے میں شریک ہوگئے تو اُس نے کان پکڑ کر اس کو باہر نکلوادیا تو آپ نے بہت جھک کر اُسے فرشی سلام کیا۔ اُس نے کہا یہ سلام کیسا۔ کہا میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو ایسے موقعہ پر جوتہ کھانے کی عادت ہے آپ نے بڑا کرم کیا کہ کان پکڑ کر نکلوادینے ہی پر کفایت کی خیر یہ حکایت تو کسی ذلیل نا معقول مسخرہ کی ہے مگر اس میں اتنا سبق قابل اخذ ہے کہ جو شخص بڑی مصیبت کے لئے آمادہ ہو اس کو چھوٹی مصیبت غنیمت معلوم ہوگی۔

حصول راحت کا گُر

پس تمام تر کلفت (۲) کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے لئے ایک خاص تجویز کر لیتے ہیں مثلاً اپنے متعلقین سے کچھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور اگر

(۱) مال دار مسافر (۲) پریشان۔

پہلے ہی سے اُس توقع کو قطع کردیا جائے تو پھر زیادہ کلفت نہ ہو۔ اور یہی وہ بات ہے جو اہل اللہ کو حاصل ہے وہ کسی مخلوق سے توقع نہیں رکھتے نہ کوئی تجویز اپنے لئے قائم کرتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام کو اسی بات کی وصیت کی کہ اگر راحت چاہتے ہو تو مخلوق سے توقع کو قطع کردو۔ پھر فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو۔ خدام نے عرض کیا کہ ہم آپ کو اپنی ذات سے زیادہ اپنے حال پر مہربان سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ فرمایا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نہ رکھو تا کہ تم کو کلفت نہ ہو۔ اگر نفع یا ارشاد میں کچھ کوتاہی اور کمی ہو تو تم کو رنج نہ ہو غالب نے اسی مضمون کو خوب بیان کیا ہے۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب پھر کسی سے کوئی گلہ نہ رہا

غم دور کرنے کا طریقہ

مگر آج کل حالت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے ایک خاص تجویز قائم کئے ہوئے ہے جس میں بعض کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جہلاء دین موت کے متعلق بھی مفتی بننا چاہتے ہیں کہ ملک الموت اول اُن سے فتویٰ حاصل کرکے کہ چہ فرمایند جہلاء دین دریں مسئلہ کہ برشما کدامی وقت موت آوردہ شود پھر جان قبض کرنے کو آیا کرے(۱) چنانچہ جس کے دو چار بچے ہوں وہ یوں چاہتا ہے کہ ان کی شادی وغیرہ سے فراغت ہوجائے تب موت آئے اس سے پہلے نہ آئے۔

صاحبو! ان تجویزوں کو قطع کرو۔ کیونکہ تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں بلکہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ط﴾ آسمان وزمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے زندہ کرنا مارنا ان ہی کے اختیار میں ہے وہ جب چاہیں جس حالت میں چاہیں کرسکتے ہیں تم کو اس میں دخل درمعقول کا کوئی حق نہیں(۲) یہی تعلیم ہے

(۱) جہلائے دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں آپ کی موت کس وقت واقع ہونی چاہئے ملک الموت پوچھے پھر ان کی روح جسم سے نکلا (۲) تمہیں اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں جب اس تعلیم پر عمل کروگے تو یہ حال ہوجائے گا۔

جو اس آیت میں دی گئی ہے۔اس پر عمل کرنے سے غم کی جڑ کٹ جائے گی۔

طبعی غم کا فائدہ

ہاں طبعی غم ہوگا مگر وہ دیرپا نہیں ہوتا غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اُس میں حکمتیں ہیں ۔ ہمارے لئے بڑی حکمت یہ ہے کہ غم سے شکستگی کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے تکبر وغرور وغیرہ کا علاج ہوجاتا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت حکمتیں ہیں یہ میں نے اس لئے کہہ دیا تا کہ آپ کو دھوکہ نہ ہو کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اس تعلیم پر عمل کرنے سے غم بالکل نہ ہوگا۔سو خوب سمجھ لیجئے کہ میں طبعی غم کی نفی نہیں کرتا۔رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر قرآن پر عمل کرنے والا کون ہوگا مگر طبعی غم حضور کو بھی ہوا چنانچہ اپنے صاحبزادہ کے انتقال پر آپ نے فرمایا:(انا بفراقك یاابراھیم لمحزونون) کہ اے ابراہیم ہم کو تمہاری جدائی کا غم ہے۔اور یہ حضور ﷺ کے صدق وحقانیت کی بڑی دلیل ہے کہ حضور نے اپنے غم کو ظاہر فرمادیا بنا ہوا صوفی ایسے موقعہ پر کبھی یہ نہ کہے گا کہ مجھے غم ہوا بلکہ تکلف وتصنع کر کے غم کو چھپائے گا۔مگر صادقین کی یہ شان نہیں وہ تو حضور کا اتباع کرے گا۔

مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا حال

چنانچہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے ایک بار فرمایا کہ ایک دفعہ ہم بیمار ہوئے ہم بڑے گھبرائے ہم کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے (اس کو بے تکلّف ظاہر کردیا کہ ہم کو موت سے ڈر لگتا ہے کیونکہ طبعاً تو ہر شخص کو موت سے خوف ہے ہی ۱۲) حالانکہ مولانا مرحوم صاحب جذب تھے اور اہل جذب واستغراق کو موت سے ڈر نہیں لگتا مگر مولانا کو خوف تھا تو بے تکلف اسکو بھی ظاہر کردیا پھر فرمایا کہ ہم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا انہوں نے ہمیں اپنے سینہ سے لگالیا بس صبح کو ہم اچھے ہوگئے۔اس واقعہ سے تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا کو موت سے ڈر تھا مگر

اس کے ساتھ ان کے کمالات سنئے کہ مولانا نے خود مجھ سے ہی فرمایا کہ جب حوریں جنت میں ہمارے پاس آئیں گی (ایسی طرح کہا کہ جیسے یقین ہو کہ جنت میں تو جائیں ہی گے ۱۲) تو ہم اُن سے صاف کہہ دیں گے کہ بی اگر ہم کو قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔ قرآن سے مولانا کو بڑا عشق تھا۔ ایک بار فرمایا کہ سجدہ میں ایسا مزا آتا ہے کہ جیسے خدا تعالیٰ نے پیار کرلیا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے ایک جذامی (۱) کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے پھر فرمایا کہ اس اتباع سنت کی برکت یہ ہوئی کہ وہ جذامی اچھا ہوگیا۔ سبحان اللہ! اس کو اپنی کرامت نہیں سمجھا بلکہ اتباع سنت کی برکت سمجھا کوئی ناقص ہوتا تو اس کو اپنی کرامت سمجھتا۔ تو یہ کمالات تھے مولانا کے اب ان کمالات کے ہوتے ہوئے مولانا کا یہ فرمانا کہ ہمیں موت سے بہت ڈر لگتا ہے نقص کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کا منشا صدق وخلوص تھا۔ کہ جو حالت تھی صاف صاف ظاہر کردی بنا ہوا صوفی بڑے بڑے دعوے کرتا ہے صادقین دعاوی (۲) سے بری ہوتے ہیں۔

قطع تجویز کا فائدہ

کانپور میں ایک صوفی میرے پاس آئے اور اپنی حاجت ظاہر کی کہ مجھے دس روپئے (۳) کی حاجت ہے اس کا انتظام کردو پھر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے کہنے لگے کہ مجھے کیا پرواہ ہے جنت کی کیا پرواہ ہے دوزخ کی میں نے کہا صوفی جی بس بیٹھو تم سے دس روپیہ سے تو استغنا ہو نہ سکا جنت سے تو تم کیا استغنا کروگے جنت کو دیکھا نہیں ہے اس لئے یہ باتیں بناتے ہو۔ بہر حال تجویز کو قطع کرو کیونکہ تجویز سے کلفت ہوتی ہے۔ اور یہ کلفت اور چیز ہے اور طبعی غم اور چیز ہے۔ تجویز کے قطع

(۱) جزام کا مرض جس کو لاحق ہو اس کو جزامی کہتے ہیں اس مرض میں جسم سے خون اور پیپ نکل کر بہتا ہے (۲) دعووں سے (۳) ضرورت۔

کرنے سے یہ کلفت اور پریشانی قطع ہوجاتی ہے گوطبعی غم باقی رہے۔مگر قطع تجویز کے بعد جوطبعی غم ہوگا اُس سے کلفت و پریشانی نہ ہوگی۔اہل دنیا کو مصائب میں اسی لئے کلفت زیادہ ہوتی ہے کہ وہ تجویزیں قائم کرلیتے ہیں۔

موت کے وقت اہل اللہ کا حال

اور اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ وہ تو موت تک کے مشتاق ہوتے ہیں جو اکبرالمصائب (۱) ہے چنانچہ عارف فرماتے ہیں ۔

خرم آن روز کزیں منزل ویران بروم   راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے   تا در میکدہ شاداں وغزلخواں بروم (۲)

ایک بزرگ نزع کی حالت میں تھے سب لوگ رو رہے تھے اور وہ خوش ہوکر یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سراسر جاں شوم (۳)

اور یہ فرمارہے تھے ۔

چیست توحید آنکہ از غیر خدا   فرد آئی در خلاد در ملا (۴)

اس توحید کا پورا ظہور موت کے وقت ہوتا ہے کیونکہ توحید خالص تو یہی ہے کہ غیرحق سے تعلقات منقطع ہوجائیں اور تعلقات ما سویٰ اللہ کا انقطاع کلی موت سے ہوتا ہے اس لئے اہل اللہ جو توحید خالص کے عاشق ہیں وہ تو موت کے مشتاق ہیں کوئی طبعاً مشتاق کوئی عقلاً مشتاق۔

---

(۱) سب مصیبتوں سے بڑی ہے (۲) وہ کتنا پیارا دن ہوگا کہ میں قربستان کی طرف جاؤں گا جان کی راحت کو طلب کرتا ہوا محبوب کی طرف جاؤں گا میں نے یہ منت مانی ہے کہ جس وقت یہ مبارک وقت آئے گا تو میں میکدہ (قبرستان) تک غزل گاتا ہوا جاؤں گا (۳) وہ وقت آگیا ہے کہ میں لباس اتاردوں میں اس جسم کے لباس کو اتار کر سراپا جان بن جاؤں (۴) توحید کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کے علاوہ غیروں سے امید ہی نہ رکھے۔

اجتماع ضدین

مگراہل اللہ اسی کے ساتھ دعا اور دوا بھی کرتے ہیں انہوں نے جمع بین الاضداد (۱) کر کے دکھلا دیا ہے وہ تجویز کو بھی قطع کرتے ہیں اوراس کے ساتھ دعا بھی الحاح سے کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں حکم ہے لیعزم المسئلة وان اللّٰه یحب الملحین فی الدعاء اور دوا کے ساتھ پرہیز بھی کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پرہیز کا حکم دیا تھا اور خود حضور نے دوا کی ہے تو ظاہر میں تفویض و قطع تجویز کے ساتھ (۲) اس کا جمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے خصوصاً دعا بالالحاح (۳) کا کیونکہ دعا میں تو طلب ہے اور طلب تجویز ہے (۴) مگر محقق کی نظر وسیع ہے وہ سب کو جمع کر لیتا ہے اس طرح کہ دعا الحاح سے کرتا ہے۔ مگر دل سے ہر شق پر راضی (۵) رہتا ہے کہ جو کچھ ہوگا ہم اس پر راضی ہیں اس کو یہ فکر اور سوچ و بچار نہیں ہوتا کہ اب کیا ہوگا اس کے بعد کیا ہوجائیگا وہ دل سے ہر شق پر راضی رہتا ہے کہ جو چاہے ہوجائے جو کچھ ہوگا عین حکمت ہوگا پس اس فکر اور سوچ ہی کا قطع کرنا مطلوب ہے، اور یہی قطع فکر مدلول ہے اس آیت کا ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ﴾ (۶) اس میں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال کر بے فکر ہوجانا خوف و حزن نہ کرنا۔

ایک سوال اوراس کا جواب

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا عدم خوف و عدم حزن اختیاری ہے ظاہر میں تو غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے۔ پھر غیر اختیاری کے ساتھ امر و نہی کا تعلق کیسا (۷)۔

(۱) متضاد باتوں کو جمع کر کے دکھایا (۲) ہر کام اللہ کے سپرد کرنا اور اپنی طرف سے تجاویز کو ترک کرنا (۳) خصوصا رو کر دعا کرنا (۴) کیونکہ دعا کا مطلب مانگنا ہے جس کا مطلب ہے ایک جانب مقرر کرنا کہ یوں ہوجائے (۵) خوب گڑگڑا کر دعا کرتا ہے پھر منظوری یا عدم منظوری دونوں صورتوں پر راضی رہتا ہے (۶) سورۃ القصص: ۷ (۷) جو چیز انسان کے اختیار میں نہ ہو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دینے کا کیا مطلب۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خوف وحزن کا ابتدائی درجہ ہے وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک وہ درجہ ہے جو اس سوچ وبچار سے پیدا ہوتا ہے کہ ہائے وہ بچہ میرے پاس کھیلتا تھا مجھے لپٹتا تھا اب میری گود سے الگ ہوگیا نہ معلوم کس حال میں ہوگا۔ نہ معلوم کسی نے پکڑا ہوگا یہ درجہ اختیاری ہے اس سے ان کو ممانعت کی گئی کہ بس دریا میں ڈال کر بے فکر ہوجاؤ ہمارے سپرد کرکے پھر کچھ نہ سوچو کہ اب کیا ہوگا اور اسی سے سمجھ لو کہ بعض لوگوں کو جو خوف خدا نہ ہونے کی شکایت ہے اس میں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں کیونکہ جو خوف مامور بہ ہے[1] وہ اختیاری ہے جو فکر اور سوچ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے فقدان (۲) کی شکایت ہے وہ غیر اختیاری ہے اور وہ مامور بہ نہیں پس غیر مامور بہ کے فقدان (۳) سے غم کیوں ہے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سوچ اور فکر قطع کرو کہ ہائے وہ بچہ ایسا تھا، ویسا تھا۔ اس کے قطع کرنے سے ان شاء اللہ غم کو ترقی نہ ہوگی۔

بعض لوگوں کے غم کے کم نہ ہونے کی وجہ

اس پر شاید شبہ ہو کہ بعض لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں پھر بھی ان کا غم کم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر میرے دل میں ابھی اس کی وجہ آئی ہے وہ یہ کہ لوگ جس طرح اُس واقعہ کو نہیں سوچتے جس سے غم بڑھتا ہے اسی طرح اسباب تسلی کو بھی نہیں سوچتے جس سے کم ہوتا ہے اس وجہ سے غم میں کمی نہیں ہوتی اور بحالہ رہتا ہے (۴) ان کو چاہئے کہ اسباب تسلی کو سوچا کریں۔ مثلاً یہی کہ حق تعالیٰ کے افعال حکمت سے خالی نہیں ہوتے اس میں ضرور حکمت ہے اور یہ کہ موت مسلمان کے لئے باعث راحت ہے وغیرہ وغیرہ۔

---

(۱) جس خوف کو اختیار کرنے کا حکم ہے (۲) جس کے نہ ہونے کی شکایت ہے وہ غیر اختیاری ہے اس کا حکم نہیں دیا گیا (۳) پس جس کا حکم نہیں اس کے نہ ہونے کا غم کیوں (۴) اپنے حال پر قائم رہتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا اعتماد

غرض حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لاتخافی ولا تحزنی ’’خوف وغم نہ کرو‘‘ میں قطع خوف وحزن کا امر فرمایا ہے(۱) اس کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ خودمت سوچنا کہ ہائے اب کیا ہوگا اب بچہ کس حال میں ہوگا بلکہ ان کو دریا میں ڈال کر بےفکر ہو جانا۔ ہائے ان کا کیسا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے بچہ کو دریا میں ڈال کر بےفکر ہو گئیں اور کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔

حضرت ہاجرہ کا بھروسہ

اور اس سے عجیب تر حضرت ہاجرہ کا واقعہ ہے کہ جب ان کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توجہ حضرت ہاجرہ پر پہلے سے زیادہ ہوگئی تو حضرت سارہ کو یہ امر ناگوار ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہاجرہ کو میری نگاہ سے غائب کردو مجھ سے اس رقابت کا تحمل نہیں ہوسکتا اس پر وحی نازل ہوگئی اور شام سے مکہ جانے کا حکم ہوگیا کہ اے ابراہیم اللہ تعالیٰ کو علاوہ سارہ کے خاطر منظور ہونے کے ہاجرہ کی مہاجرت میں کچھ حکمتیں بھی منظور ہیں (۲) پس تم ہاجرہ کو مع اسمٰعیل کے زمین مکہ میں چھوڑ آؤ جہاں ہمارا گھر ہے جس کو تم اور اسمٰعیل بناؤ گے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کو سواری پر سوار کیا اور زمین مکہ میں لاکر ان کو اتار دیا اور ایک تھیلی کھجوروں کی اور ایک مشکیزہ پانی کا ان کے پاس چھوڑ کر ملک شام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت زمین مکہ میں کسی قسم کی کچھ آبادی نہ تھی لق ودق میدان تھا جہاں آدمی تو آدمی پرند وچرند کا بھی نام ونشان نہ تھا کیونکہ یہاں نہ کھانے کی کوئی چیز تھی نہ پینے کے لئے پانی تھا۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو چھوڑ کر

(۱) خوف اور غم نہ کرنے کا حکم دیا (۲) حضرت ہاجرہ کی ہجرت میں حضرت سارہ کی دلداری کے علاوہ بھی حکمتیں ہیں۔

واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہ نے اُن سے پوچھا کہ اے ابراہیم ہم کو یہاں چھوڑ کر جو چلے کیا یہ آپ کی رائے ہے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے فرمایا ہاں حکم دیا ہے بس یہ سن کر حضرت ہاجرہ کو اطمینان ہوگیا اور فرمایا اذاً لا یضیعنا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو وہ ہم کو ضائع نہ کریں گے ہائے کیسا کلیجہ تھا؟ کیسا خدا پر بھروسہ تھا کہ حضرت ہاجرہ نے یہ سن کر کہ خدا کی مرضی یونہی ہے کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا؟

حضرت ہاجرہ کا عجیب ایمان

صاحبو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال ایمان تو اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے مگر حضرت ہاجرہ کا ایمان گو اُن سے اکمل نہ ہو مگر عجیب تر ضرور تھا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو مرد تھے پھر مرد بھی کامل کیونکہ نبی تھے اور نبی بھی بڑے درجہ کے کہ ہزاروں انبیاء ان کے متبع تھے۔ ان کا ایمان گو اکمل ہو مگر ایسا عجیب نہیں جیسا حضرت ہاجرہ کا ایمان عجیب تھا کہ انکو باوجود عورت ہونے اور نبی نہ ہونے کے ذرا بھی تشویش (۱) نہیں ہوئی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان حضرت ابراہیم کے ایمان سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ عجیب ہونے سے افضل واقوی ہونا لازم نہیں آتا پس ہر چند کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان اعجب تھا مگر اقویٰ واکمل و افضل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تھا۔

ایمان اعجب کی تعریف

اور یہی جواب ہے اُس حدیث کا جس میں وارد ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا بتلاؤ کس کا ایمان عجیب تر ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ملائکہ کا ایمان۔ فرمایا ملائکہ کو کیا ہوا کہ وہ ملکوت سموات والارض کا مشاہدہ کر کے بھی ایمان نہ لاتے۔ صحابہ نے کہا پھر حضرات انبیاء کا ایمان عجیب ہے فرمایا ان کو کیا ہوا کہ وحی

(۱) پریشانی۔

کے نزول اور معجزات کے عطا ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائیں صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان اعجب ہے فرمایا تمہیں کیا ہوا کہ میں تمہارے سامنے ہوں رات دن تم میرے معجزات دیکھتے ہو نزول وحی کا مشاہدہ کرتے ہو پھر بھی ایمان نہ لاؤ۔ صحابہ نے عرض کیا پھر حضور ہی بتلائیں کس کا ایمان اعجب ہے، فرمایا عجب تر ایمان ان لوگوں کا ہے جو میرے بعد آئیں گے جو صرف چند اوراق قرآنیہ کو دیکھ کر مجھ پر ایمان لائیں گے اور یہ تمنا کرینگے کہ کاش ان کا سب مال ومتاع لے لیا جائے اور ایک نگاہ سے مجھ کو دیکھ لیں۔ تو ان لوگوں کے ایمان کے اعجب ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا ایمان انبیاء ملائکہ وصحابہ کے ایمان سے اکمل و اقوی ہے ہرگز نہیں عجیب ہونا اور بات ہے کامل وقوی ہونا اور بات ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ طبعی غم اور چیز ہے۔ اور فکر کرنا سوچنا اور چیز ہے اول غیر اختیاری ہے اور دوسرا درجہ اختیاری ہے اسی کو قطع کرنے کا حکم ہے کہ تم یہ نہ سوچو کہ ہائے اب کیا ہوگا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اور حضرت ہاجرہ نے نہیں سوچا ؎

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد(۱)

فکر آخرت

شاید اس پر یہ سوال ہو کہ کیا عذاب آخرت کا سوچنا بھی برا ہے کہ ہائے میرا کیا انجام ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب آخرت کا سوچنا دوسری خاصیت رکھتا ہے وہ تو منجی ہے(۲) کہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے اس سے کلفت وکدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس فکر سے قلب میں نورانیت وانشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہوجاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے حدیث میں ہے (مـــن

(۱) عقلمند دل پر افسوس ہے کہ وہ پریشان ہے (۲) تمام پریشانیوں سے نجات کا باعث ہے۔

جعل الهموم هما واحداهم الآخرة كفى الله همومه ومن تشعبت همومه في الدنيا لم يبال الله به باى وادهلك)اوکما قال یعنی جس نے اپنے سب فکروں کو ایک فکر میں مدغم کردیا یعنی آخرت کے فکر میں اللہ تعالیٰ اس کے سارے افکار کو دور کردیتے ہیں اور جس نے دنیا کے اندر افکار کو منتشر کررکھا ہے خدا کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ کہیں جا کر ہلاک ہو اسی لئے شریعت نے فکر آخرت کی تعلیم تاکید کے ساتھ کی ہے کیونکہ یہ فکر تمام مضر افکار کو قطع کرنے والی ہے [۱] حدیث میں ہے (يا عبدالله عد نفسك من اهل القبور اذا اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسيت فلا تحدث نفسك بالصباح)(اوکما قال) اے عبداللہ بن عمر واپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو جب صبح ہو تو شام کی امید نہ کرو جب شام ہو تو صبح کی امید نہ کرو۔ بتلایئے جس شخص کی یہ حالت ہوگی وہ کیونکر مشوش و پریشان [۲] ہوسکتا ہے وہ تو یہ سمجھے گا کہ کوئی مصیبت باقی رہنے والی نہیں کیا خبر صبح سے شام اور شام سے صبح بھی ہوگی یا نہیں۔ اب سب اشکالات رفع ہوگئے اور ثابت ہوگیا کہ پریشانی کی جڑ تجویز ہے اور طبعی غم اس سے بڑھتا ہے کہ لوگ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہائے اب کیا ہوگا کیونکر ہوگا کبھی مستقبل کو سوچتے ہیں کبھی ماضی کو سوچتے ہیں کہ ہائے وہ بچہ جو مر گیا وہ یوں کھیلتا تھا اس طرح باتیں کرتا تھا یوں آکر لپٹتا تھا پس تم دنیا کے مصائب کو از خود سوچ سوچ کر نہ بڑھاؤ نہ کسی تجویز کو طے کرو بلکہ خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کردو۔

تفویض کا فائدہ

ابتدا میں تو اہل اللہ کو یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے پھر یہ

(۱) یہ سوچ تمام نقصان دہ سوچوں کو ختم کردے گی (۲) وہ کس طرح کسی تشویش و پریشانی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

حالت اُن کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے چنانچہ حضرت بھلول نے کسی عارف سے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے فرمایا اُس شخص کا مزاج کیا پوچھتے ہو کہ عالم میں کوئی فعل اس کی خواہش کے خلاف نہیں ہوتا۔ کہا یہ کیونکر؟ فرمایا کہ میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہے اور خدا کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ بھی نہیں ہوتا تو میری خواہش کے خلاف بھی کچھ نہیں ہوتا صاحبو! یہ کچھ مشکل کام نہیں کہ اپنے ارادہ کو دوسرے کے ارادہ کا تابع کردیا جائے ایک بچہ بھی ایسا کرسکتا ہے چنانچہ ایک لڑکا کانپور میں زبردستی ایک شخص کا امام بن گیا اُس نے یہ کیا کہ اُس کے آگے کھڑا ہوکر نماز پڑھنے لگا اور گوشۂ چشم (۱) سے دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتا ہے جب وہ رکوع میں جانے کو ہوتا یہ اُس سے پہلے رکوع کردیتا جب وہ سجدہ کرنا چاہتا یہ اُس سے پہلے سجدہ میں چلا جاتا اسی طرح ساری نماز میں اُس کا امام بنا رہا تو جب ایک بچہ نے اپنے ارادہ کو دوسرے کے تابع کرکے دکھلا دیا تو کیا آپ خدا کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے کہ اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کا تابع کردیں کہ جو کچھ ہوگا ہم اُس پر راضی ہیں اس پر عمل شروع کردیجئے اور برابر کرتے رہئے ان شاء اللہ ایک دن ملکہ راسخہ (۲) پیدا ہوجائیگا اور اسی سے راحت حاصل ہوگی بدون (۳) اس کے راحت نہیں مل سکتی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ کثرت تکرار (۴) سے سب کام آسان ہوجاتے ہیں دیکھئے آجکل جو لوگ پختہ حافظ ہیں وہ پہلے ہی دن سے پختہ نہیں ہوئے بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے (۵) ہیں آج جو خوشنویس (۶) ہے وہ کثرت مشق ہی سے خوشنویس ہوا ہے۔ اسی طرح آپ بھی کثرت تکرار سے تفویض کو حاصل کرلیں گے اور یہ کوئی بزرگی نہیں کہ عوام اپنے کو اسکا اہل نہ سمجھیں بلکہ یہ تو عبدیت اور بندگی ہے غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

---

(۱) آنکھ کے کنارے (۲) خوب مشق ہوجائیگی (۳) اس کے بغیر (۴) بار بار کرنے سے (۵) بار بار پڑھنے سے قرآن پکا یاد ہوگیا (۶) جس کی تحریر عمدہ ہے۔

اتباع شیخ

صاحبو! اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق کیونکر نہ کیا جائے حالانکہ شیخ کے ساتھ بھی جو ایک مخلوق ہے اسی معاملہ کی ضرورت ہے شیخ سے جس کام کے لئے تعلق پیدا کیا جاتا ہے وہ بدوں تفویض کے نہیں ہوسکتا کہ جو حالت پیش آئے اس کو شیخ سے عرض کرکے بے فکر ہو جاؤ اس کے بدوں کام نہیں چل سکتا کیونکہ تسلی کی یہی صورت ہے کہ ایک شخص پر اعتماد کرکے جو وہ کہے اُس کے موافق کام کرتے جاؤ اور بے فکر ہو جاؤ اور یہی حکمت ہے تقلید شخصی میں۔ واللہ بدوں تقلید کے غیر مجتہد کو بشرطیکہ خدا کا خوف اس کے دل میں ہو کبھی چین نہیں مل سکتا۔ جب چاہو تجربہ کرکے دیکھ لو۔

شیخ پر اعتماد

پس اگر شیخ تمہاری تسلی کرے تو تم تسلی رکھو اور فکر میں نہ پڑو یہاں تھانہ بھون ہی میں ایک حافظ صاحب تھے وہ مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کچھ حالات مجھ سے بیان کئے میں نے تسلی کی کہ یہ حالت بری نہیں بے فکر رہو کہنے لگے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی سے بھی عرض کیا تھا انہوں نے بھی تسلی کی تھی میں یوں سمجھا کہ ویسے ہی میرا دل بہلانے کو تسلی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا حافظ صاحب تو بہ کیجئے مولانا کو جھوٹی تسلی کی کیا ضرورت تھی وہ کسی کے نوکر ہیں ان کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے جو بلاوجہ آپ کی تسلی کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حضرت پر اعتماد نہیں اب ان کی آنکھیں کھلیں اور چین سے بیٹھے۔ اور میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اگر شیخ کی تسلی غلط بھی ہو جب بھی تم کو وہی نافع ہے (۱) اگر تم اس کو غلط سمجھو گے تم کو نقصان ہوگا۔

تو جب شیخ کے ساتھ بھی اسی معاملہ کی ضرورت ہے تو حیرت ہے کہ خدا تعالیٰ

(۱) مفید ہے۔

کے ساتھ تفویض کا تعلق نہ ہو۔ اسی کو اللہ تعالیٰ اس مقام پر بیان فرماتے ہیں: ﴿اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ خدا ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں ۔ پس ہر قسم کے تصرف کا حق اسی کو ہے دوسروں کو کسی تجویز کا حق نہیں گو اس میں یہ احتمال تھا کہ تصرفات تشریعیہ کا حصر (۱) مراد ہو مگر آگے یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ بھی مذکور ہے جو میرے مقصود کے مناسب ہے بلکہ اسمیں تصریح ہے کہ مراد تمام تصرفات تکوینیہ کو بھی عام ہے کیونکہ احیاء و اماتت (۲) امور تکوینیہ سے ہے۔

حیات کی حقیقت

اور یہ بات تو کل ہی سمجھ میں آئی ہے کہ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ سے کوئی تصرف خارج نہیں بلکہ تمام تصرفات کا حاصل احیاء واماتت ہی ہے شاید تم کہو کہ کیا کھیتی کا اگانا اور پکانا بھی اسمیں داخل ہے تو میں کہوں گا ہاں وہ بھی احیاء کا ایک فرد ہے اسی لئے ارشاد ہے: ﴿اِعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا﴾ محاورات میں احیاء نفخ روح (۳) کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ عام ہے اور ہر شے کا احیاء الگ ہے۔ دوسرے میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہر چیز میں روح بھی ہے صوفیہ کو تو اس کا کشف ہوا ہے اور فلاسفہ دلائل سے اس کے قائل ہوئے ہیں۔ اور میری رائے تو یہ ہے کہ حیوانات میں علاوہ روح کے عقل بھی ہے کیونکہ بعض حیوانات کے افعال اس پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کو ذی عقل مانا جائے لیکن اس سے ان کا مکلّف ہونا (۴) لازم نہیں آتا کیونکہ عقل کا ہر درجہ تکلیف کے لئے کافی نہیں دیکھئے صبی مراہق (۵) میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہے مگر مراہق مکلّف (۶) نہیں تو اگر ایسا ہی درجہ حیوانات میں تسلیم کرلیا جائے تو اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

---

(۱) خاص شرعی تصرفات مراد ہوں (۲) زندگی اور موت امور تکوینیہ میں سے ہے (۳) حیات کی خصوصیت صرف روح ڈالدینے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز کی حیات الگ ہے (۴) احکام کا پابند ہونا (۵) وہ بچہ جو عنقریب بالغ ہونے والا ہو (۶) مگر ایسے بچے کو جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو احکام کا پابند نہیں بنایا گیا۔

مجذوبوں کا حال

اور یہیں سے سمجھ لیا جائے کہ بعض مجذوبین کے متعلق جن میں بظاہر کچھ عقل بھی معلوم ہوتی ہے شبہ نہ کیا جائے کہ عقل کے ساتھ اُن سے افعال واقوال غیر مشروعہ کا صدور کیونکر ہوتا ہے (۱)تم ان کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے وہ صبی (۲) کے مثل ہوں کہ باوجود کسی قدر عاقل ہونے کے مکلّف نہ ہوں۔

نباتات میں عقل وروح

بلکہ حیوانات سے تجاوز کر کے ممکن ہے کہ نباتات میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہو جو عقل حیوانی سے کم ہو آپ کو حیرت ہوگی کہ آج کل بعض اس کے قائل ہیں کہ نباتات میں روح ہے اور قدماء فلاسفہ میں بھی بعض اس کے قائل ہوئے ہیں سو ہم کو اس کے انکار کی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ جمادات میں بھی عقل وروح موجود ہو اور ان کی عقل نباتات سے بھی کم ہو اسی لئے جمادات کا نطق ممکن ہے (۳) اور جن احادیث میں حجر وشجر (۴) کی شہادت کا ذکر ہے وہ اس کی مؤید ہیں۔ اور جب ہر چیز میں روح ہے تو احیاء واماتت سے کوئی تصرف خالی نہیں۔

پانی کی روح

شاید تم کہو کہ ابراد ماء (۵) میں احیاء واماتت کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس میں ایجاد برودت ہے اور ایجاد ہی کا نام احیاء ہے (۶) اب اگر کسی کو شبہ ہو کہ

(۱) جب عقل ہے تو ان سے ایسے کام کیوں سرزد ہوتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں (۲) بچے کی مانند (۳) پتھروں کا بولنا ثابت ہے (۴) پتھروں اور درختوں (۵) پانی کے ٹھنڈے ہونے میں (۶) اس میں ٹھنڈک کا پایا جانا ہی اس کی روح ہے۔

یہ کام تو بندہ بھی کرسکتا ہے چنانچہ پنکھا کر کے یا شورہ ملا کر پانی کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ صرف اسباب کو اختیار کرتا ہے جن پر برودت کے وجود کو اللہ تعالیٰ مرتب فرمادیتے ہیں(۱) اگر تم کو ایجاد برد پر قدرت ہے تو ذرا ان اسباب کو اختیار کر کے پھر تو برودت کو روکدو(۲)۔ جب یہ نہیں کر سکتے معلوم ہوا کہ تم برد کو ایجاد نہیں کرتے ورنہ اس کے روکنے پر بھی قادر ہوتے کیونکہ قدرت کا تعلق ضدین سے ہوا کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابراد حقیقی اسباب برد اختیار کرنے کا نام نہیں بلکہ ایجاد برد کا نام ہے(۳) اور یہ تمہارا کام نہیں کیونکہ تم اسباب یا مسببات کے ایجاد پر قادر نہیں صرف ان کو اختیار کرتے ہو اور اختیار کے بعد ان کے اثر کو نہیں روک سکتے۔

نمرود کی بدعقلی

اور یہی وہ بات ہے جو نمرود بوزن مردود(۴) گدھے نے نہیں سمجھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ﴿رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ کہ میرا خدا احیاء و اماتت کرتا ہے تو اس نے کہا یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں اس کے بعد قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلا کر ایک کو مار ڈالا ایک کو رہا کر دیا حضرت ابراہیم نے سمجھا کہ یہ تو محض گدھا ہے اس پر گھوڑے کا پالان کیوں لادا(۵) تو آپ نے دوسری دلیل بیان فرمائی کہ میرا خدا تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکالدے اس پر وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نمرود اس کے جواب میں کہہ سکتا تھا

---

(۱) اسباب اختیار کرنے کے بعد اس میں ٹھنڈک پیدا کردیتے ہیں (۲) پانی ٹھنڈا کرنے کے اسباب اختیار کر کے مثلاً اس میں برف ڈالکر پھر تو پانی کو ٹھنڈا ہونے سے روک دو معلوم ہوا اس کے ٹھنڈا کرنے میں تمہارا کوئی دخل نہیں (۳) حقیقی ٹھنڈا کرنا اس کے اسباب اختیار کرنے کا نام نہیں بلکہ ٹھنڈک پیدا کرنے کا نام ہے (۴) نمرود جو مردود کے وزن پر ہے (۵) گھوڑے کی کاٹھی کیوں کسی جائے۔

کہ مشرق سے تو میں نکالتا ہوں اگر خدا کوئی ہے تو اس سے کہو کہ مغرب سے نکالے۔ اس کا جواب ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دیا ہے کہ ہاں اس کو اس کہنے کی گنجائش تھی مگر خدا تعالیٰ نے یہ جواب اس کے دل میں نہیں ڈالا کیوں کہ اگر وہ یہ جواب دیتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ سے دعا کرتے اور آفتاب مغرب سے طلوع ہوجاتا اور یہ علامات قیامت سے ہے تو اسی وقت قیامت قائم ہوجاتی مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی عالم کا بقاء مقصود تھا اس لئے نمرود کے دل میں یہ سوال نہیں ڈالا اور خارق ردشمس کو طلوع الشمس من المغرب پر قیاس نہیں کیا جاسکتا(۱) ردشمس ایک ساعت کے لئے اس طرح ہوا کہ کسی کو معلوم ہوا کسی کو معلوم نہیں ہوا اور طلوع من المغرب مثل طلوع من المشرق کے تمام آفاق کو عام ہوگا(۲) پس آیت کے عظیم ہونے کے سبب اس کا اشراط ساعت سے ہونا مناسب ہے(۳)۔ وہی میرے استاد ایک نشانی یہ بھی فرماتے تھے کہ بھت الذی کفر میں بُہِتَ بصیغۂ مجہول اسی لئے لایا گیا کہ اس کافر مجہول کو حیران بنادیا گیا اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کو سوال کی گنجائش تھی مگر اس کو حیران بنادیا گیا۔ مگر یہ نکتہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ بُہِتَ معروف بھی متعدی حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مستعمل ہو میرا خیال(۴) یہ ہے کہ (بھت) مجہول ہی تحیر کے معنی میں ہے اور اس کا معروف متعدی مستعمل نہیں۔

رفع اشکال

اس مقام پر ایک علمی اشکال ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بطور خرق عادت سورج کو واپس لوٹانے کا معجزہ ظاہر ہوا اس کو مغرب سے سورج نکلنے پر قیاس نہیں کرسکتے (۲) مغرب سے سورج کا نکلنا مشرق سے سورج نکلنے کی طرح تمام آفاق میں نظر آئے گا (۳) اتنی بڑی نشانی ہونے کے سبب اسکا علامات قیامت میں سے ہونا مناسب ہے (۴) رسالہ التبلیغ نمبر ۶ من القاموس ۱۲۔

کہ علم مناظرہ میں طے ہو چکا ہے کہ مناظرہ میں ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز نہیں(۱) ورنہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا تو حضرت ابراہیم نے دوسری دلیل کی طرف کیوں انتقال کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال اپنی مصلحت سے ممنوع ہے اور مخاطب کی مصلحت سے جائز ہے جبکہ وہ بلادت فہم (۲) کی وجہ سے دلیل اول کو نہ سمجھ سکے۔

حقیقت موت وحیات

نمرود احمق تھا وہ سمجھا نہیں کہ احیاء واماتت کے معنی ایجاد حیات وایقاع موت کے ہیں (۳) اور ابقاء حی کو احیاء نہیں کہتے نہ قتل کو اماتت کہتے ہیں (۴) کیونکہ قتل عین موت نہیں بلکہ سبب موت ہے اور بعض دفعہ قتل سے موت کا تخلف بھی ہوجاتا ہے (۵) چنانچہ ایک معتبر شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک پادری پر کچھ تہمت لگ گئی تھی اُس نے غلبۂ حیا میں کمرہ میں بند ہوکر خودکشی کرلی اس طرح کہ آئینہ سامنے رکھ کر استرے سے گلا کاٹ دیا اور گلا کٹ کر کمر کی طرف لٹک گیا صرف تھوڑی سی کھال الجھی رہ گئی۔نوکروں کو جو کمرہ سے خون بہتا ہوا نظر آیا انہوں نے فوراً ڈاکٹر اور پولیس کو اطلاع دی۔ڈاکٹر آیا اُس نے دیکھا کہ ابھی نبض وجسم میں حرارت موجود ہے اس نے فورا سر کو اپنی جگہ رکھ کر ٹانکے لگا دیئے اور دوا لگادی چند گھنٹوں کے بعد اُسے ہوش آ گیا اور بے حیا اچھا خاصہ ہوکر بہت عرصہ تک زندہ رہا البتہ آواز ذرا گنگنی ہوگئی تھی۔ پس ایسے واقعات اس کی دلیل ہیں کہ قتل اور قطع حلقوم عین موت نہیں(۵) بلکہ محض اسباب میں سے ہے جیسے سنکھیا کھانا اسباب

(۱) ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف منتقل ہونا جائز نہیں (۲) کم عقلی (۳) موت واقع کرنے کے ہیں (۴) زندگی پیدا کرنے اور زندگی کو باقی رکھنے کا نام حیات دینا نہیں ہے اور قتل کا نام موت دینا نہیں ہے (۵) باوجود قتل کردینے کے موت نہیں آتی (۶) قتل کرنا اور جگہ کاٹ دینا ہی موت نہیں ہے۔

میں سے ہے عین موت نہیں اسی لئے بہت سے سنکھیا کھا کر بچ بھی جاتے ہیں پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اُس نے قتل کو امانت سمجھا اور ایک مجرم کے رہا کر دینے کو احیاء اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دقیق دلیل کو چھوڑ کر ظاہر دلیل اختیار کی۔

تمام تصرفات کا مالک اللہ ہے

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ اسباب برد اختیار کرنے کا نام ابراد نہیں (۱) جیسا نمرود نے اسباب قتل کو امانت اور ترک اسباب موت کو احیاء سمجھا تھا (۲) بلکہ ابراد کی حقیقت ہے ایجاد برد (۳) جیسا کہ احیاء کی حقیقت ہے ایجاد حیات (۴) اور یہ بجز خدا تعالیٰ کے کسی کے قبضہ میں نہیں پس یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ کا حاصل یہ ہوا کہ تمام تصرفات اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں۔

خوشی کی اقسام

رہا یہ کہ اس عقیدہ کی بتلانے کی کیا حکمت ہے سو اس کو بھی ایک نص میں خود ہی بیان فرما دیا ہے: ﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ﴾ (۵) یہاں تک تو مسئلہ تقدیر کا بیان تھا آگے اس کی حکمت بتلاتے ہیں ﴿لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ ؕ﴾ کہ یہ مسئلہ تم کو اس لئے تعلیم کیا گیا تا کہ تم کو کسی فوت ہونے والی شئی پر رنج نہ ہو اور کسی حاصل ہونے والی شئی پر فرح (۶) نہ ہو کیونکہ فرح مطلقاً محمود نہیں بلکہ جو فرح شکراً ہو وہ محمود ہے اور اسی کا ذکر ہے اس

(۱) ٹھنڈک پیدا کرنے کے اسباب اختیار کرنا ٹھنڈک کو پیدا کرنا نہیں کہلاتا (۲) جیسے نمرود نے اسباب قتل اختیار کرنے کو موت اور ترک اسباب موت اختیار کرنے کو زندگی دینا سمجھا تھا (۳) بلکہ ابراد کا مطلب ہے ٹھنڈک کو پیدا کرنا (۴) احیاء کا معنی ہے حیات کو پیدا کرنا (۵) سورۂ حدید: ۲۳ (۶) خوشی۔

آیت میں ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ اور جو فرح بطراً[۱] ہو وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ قارون کے قصہ میں ارشاد ہے ﴿قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾[۲]

بخل وسخاوت کی حقیقت

اسی تقسیم کی بناء پر حدیث میں ہے (من اعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان) (او کما قال) اس میں اعطاء ومنع دونوں کے ساتھ للہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم[۳]۔

اچھے اور برے اخلاق کی حقیقت

اب آپ کو حاجی صاحب کی ایک تحقیق کی قدر ہوگی فرماتے تھے کہ اخلاق رذیلہ فی نفسہا مذموم نہیں[۴] بلکہ خاص مصرف کے اعتبار سے مذموم ہیں[۵] اور اگر ان کو طاعات میں صرف کیا جائے تو یہ محمود ہیں[۶] اسی طرح اخلاق حمیدہ بھی افضاء الی طاعۃ الحق کی وجہ سے محمود ہیں[۷] پس اگر سخاوت وغیرہ معاصی کی طرف مفضی ہو جائے تو محمود نہیں بلکہ مذموم ہیں[۸] غرض اخلاق سب فطری اور جبلی ہیں اور درجۂ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم نہ محمود[۹] بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے[۱۰] اسی کی نوع سے فرح بھی ہے کہ یہ مطلقاً محمود نہیں بلکہ

(۱) جو خوشی بطور سرکشی ہو وہ پسندیدہ نہیں ہے (۲) سورۃ قصص: ۷۶ (۳) سخاوت و کنجوسی نہ مطلقاً اچھی نہ مطلقاً بری بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہو تو اچھی ورنہ بری (۴) برے اخلاق اپنی ذات کے اعتبار سے برے نہیں (۵) بلکہ جہاں استعمال ہو رہے ہیں اس کے اعتبار سے برے ہیں (۶) اچھے ہیں (۷) اچھے اخلاق بھی اسی لئے اچھے ہیں کہ وہ حق کی اطاعت کرنے کا باعث ہوتے ہیں (۸) اگر گناہ کا سبب بن جائیں تو اچھے نہیں ہیں (۹) اپنی تخلیق کے اعتبار سے کوئی خلق برا نہیں (۱۰) بلکہ استعمال کے موقع کے اعتبار سے اچھے یا برے کہلاتے ہیں۔

بعض افراد اس کے مذموم بھی ہیں جن کا ترجمہ عجب اور پندار اور اترانا ہے۔

مسئلہ تقدیر کا فائدہ

تو مسئلہ تقدیر اس لئے بتلایا گیا تاکہ مصائب میں کسی شئے کے فوت ہونے سے رنجیدہ نہ ہو اور نعمت وراحت پر اترائے نہیں کیونکہ قائل تقدیر یہ سمجھے گا کہ جو کچھ حاصل ہوا میرے کسب وکمال سے نہیں بلکہ تقدیر میں یوں ہی تھا اور آئندہ کی خبر نہیں کہ تقدیر میں کیا ہے تو وہ کبھی نہ اترائے گا نہ دنیا سے دل لگائے گا اور یہی راحت کی چیز ہے کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیا سے زیادہ خوشی ہوتی ہے زوال کے وقت ان کو اسی قدر رنج بھی ہوتا ہے اور اگر خوشی نہ ہو یا اعتدال سے ہو تو رنج بالکل نہ ہو یا اعتدال سے ہو حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ قلب کو جتنی قوت اعتقاد وتقدیر سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوسکتی کفار چاہے لاکھ یاقوتیاں(۱) کھائیں مگر اس اکسیر کے سامنے سب گرد ہیں(۲) بخدا تقدیر کا اعتقاد دل کو نہایت مضبوط کردیتا ہے۔ یہ شخص کسی حالت میں متزلزل نہیں ہوتا(۳) جو مصیبت سامنے آئے گی یوں کہے گا کہ یہ تو مقدر تھی ٹلنے والی نہ تھی خواہ میں راضی ہوں یا ناراض پھر خدا کی تقدیر سے ناراض ہوکر عاقبت بھی کیوں خراب کی۔ نیز اسی کے ساتھ اس کے دل میں یہی آتا ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہے یہ تو حکمت کا علم اجمالی ہے پھر اس کے بعد یہ چاہئے کہ احادیث میں جو تفصیلی حکمتیں مصائب وحوادث کی مذکور ہیں نیز ان پر جو ثواب بتلایا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھیں تو انشاء اللہ غم بہت کم ہوجائیگا۔

(۱) یاقوت ملے طاقتور خمیرے کھائیں (۲) بیکار (۳) ڈولتا نہیں۔

چھوٹے بچوں کی موت میں حکمت

چنانچہ چھوٹے بچوں کی موت میں ایک بڑی حکمت ہے اگر وہ پیش نظر رہے تو چھوٹے بچوں کے مرنے پر غم کے ساتھ خوشی کا بھی ایک پہلو سامنے ہوگا لوگوں کو اولاد کے بڑے ہونے کی خوشی محض اس لئے ہے کہ انکا نفس یوں ہی چاہتا ہے ورنہ ان کو کیا خبر کہ بڑے ہوکر یہ کیسا ہوگا باعث راحت والدین ہوگا یا وبال جان ہوگا پھر وہ بڑا ہوکر مرے تو یہ خبر نہیں کہ وہ والدین کو آخرت میں کچھ نفع دے گا یا خود ہی سہارے کا محتاج ہوگا اور بچپن میں مرنے والے بچے بہت زیادہ کارآمد ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں کہ دیکھئے آخرت میں یہ خود کس حال میں ہو کیونکہ غیر مکلّف تو یقیناً مغفور لہٗ ہے[1] وہ آخرت میں والدین کے بہت کام آئے گا ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے جوانی میں نکاح نہ کیا تھا اور مجرد[2] ہی رہنے کی نیت تھی ہر چند مریدوں نے عرض بھی کیا مگر آپ نے منظور نہ کیا ایک دفعہ دوپہر کو سوکر اٹھے تو اسی وقت تقاضا کیا کہ جلدی میرا نکاح کرو۔ مریدوں نے فوراً اس کی تعمیل کی ایک مرید نے اپنی لڑکی سے نکاح کردیا آپ نکاح کے حقوق ادا کرتے رہے یہاں تک کہ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا اور کچھ دنوں کے بعد مر بھی گیا جب وہ بچہ مرگیا تو آپ نے فرمایا الحمدللہ مراد حاصل ہوگئی اور بیوی سے کہا کہ اب مجھے تیری ضرورت نہیں میرا جو مقصود تھا پورا ہوگیا اب اگر تو نکاح کا لطف حاصل کرنا چاہے تو میں طلاق دے کر کسی جوان صالح سے تیرا نکاح کردوں اور اگر میرے ہی پاس رہنا چاہے تو کھانے پہننے کی تیرے واسطے کمی نہیں مگر حقوح نکاح کا مطالبہ نہ کرنا وہ لڑکی بھی نیک تھی اُس نے کہا مجھے تو صرف آپ کی خدمت مقصود ہے اور کچھ

(۱) نابالغ جو ابھی تک احکام کا پابند نہیں کیا گیا ہے وہ تو بخشا ہوا ہی ہے (۲) کنوارہ۔

مطلوب نہیں مگر خدام کو یہ بات سن کر حیرت ہوئی کہ یا تو اس تقاضے سے نکاح کیا تھا یا اب طلاق کو آمادہ ہوگئے انہوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے نکاح کا تقاضا کسی نفسانی ضرورت کی وجہ سے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا منشا یہ تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا میدان قیامت برپا ہے اور لوگ پلصراط سے گذر رہے ہیں جو دوزخ کے اوپر بچھایا گیا ہے پھر میں نے ایک شخص کو دیکھا پلصراط سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگائے اور قریب تھا کہ جہنم میں جا گرے دفعۃً ایک بچہ نے آکر اس کو سنبھالا اور مضبوطی کے ساتھ اُس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی طرح پلصراط سے پار کر کے لے گیا میں نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ بچہ کون تھا کہا اسی شخص کا بیٹا تھا جو بچپن میں انتقال کر گیا تھا آج اس کا شفیع ہوگیا(۱)۔ خواب سے بیدار ہو کر مجھے فکر ہوئی کہ میرے پاس آخرت کی اور جائیدادیں تو ہیں نماز روزہ وغیرہ مگر یہ جائیداد نہیں اور زمیندار کو ہر قسم کی جائیداد جمع کرنی چاہئے کیونکہ بعض دفعہ ایک جائیداد میں پیداوار نہیں ہوتی دوسری میں ہوجاتی ہے۔ کبھی مویشیوں (۲) میں نفع ہوگیا اور گیہوں کے کھیت میں نقصان دونوں ملکر اوسط برابر ہوجاتا ہے کبھی باغ میں فائدہ ہوگیا جانوروں میں خسارہ ہوگیا تو ہر قسم کی جائداد والا فائدہ ہی میں رہتا ہے اس لئے ان بزرگ نے چاہا کہ یہ جائداد بھی پاس ہونا چاہئے چنانچہ نکاح ہوا اور بچہ پیدا ہو کر مر گیا تو ان کا مقصود حاصل ہوگیا۔

ماں باپ کے حق میں بچوں کی سفارش

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچے جنت میں جانے سے پہلے آخرت میں بھی بچے ہی رہیں گے اور ان کی خصلتیں بھی بچوں کی سی رہیں گی وہی ضد کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا سر ہوجانا مگر یہ حالت دخول جنت سے پہلے ہوگی پھر جنت میں پہنچ کر باپ بیٹے سب برابر ایک قد کے ہوجائیں گے حدیث میں آیا ہے کہ یہ

(۱) سفارشی بن گیا (۲) جانوروں۔

بچے اڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے جب تک ہمارے ماں باپ کو ہمارے حوالہ نہ کیا جائے ہم تو ان کو اپنے ساتھ لیکر جنت میں جائیں گے تو حق تعالیٰ فرمائیں گے (ایھا الطفل المراغم ربه ادخل ابویك الجنة) کہ اے ضدی بچے اپنے خدا سے ہٹ کرنے والے جا اپنے والدین کو بھی جنت میں لے جا اس وقت یہ خوش خوش جنت میں اپنے باپ ماں کے ساتھ جائیں گے۔

تو یہ بے گناہ بچے اللہ میاں سے بھی آپ کی بخشش کے لئے ضد کریں گے۔ اور اگر بچہ بڑا ہو کر مرجائے تو حضرت خضر کا واقعہ یاد کر کے دل کو یہ سمجھا لو کہ نہ معلوم اسمیں کیا حکمت ہوگی شاید اگر یہ اور زندہ رہتا تو دین کو بگاڑ لیتا یا دنیا میں وبال جان ہوجاتا مولانا فرماتے ہیں ؎

آن پسر راکش خضر ببرید حلق　　　سرآں رادرنیابد عام خلق(۱)

اور اگر کسی کے بالکل ہی اولاد نہ ہو وہ یوں سمجھے کہ میرے لئے یہی حکمت ہے نہ معلوم اولاد ہوتی تو کن کن مصائب کا سامنا ہوتا چنانچہ خدا نے مجھے اولاد نہیں دی میں اس کو اپنے واسطے عین حکمت سمجھتا ہوں۔

اولاد ہونے یا نہ ہونے میں حکمت

حضرت حاجی صاحب سے میرے گھر میں کی خالہ نے دعا کے واسطے عرض کیا تھا کہ اشرف علی کے اولاد ہوجائے۔ حاجی صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی تمہاری خالہ اولاد کے لئے دعا کرنے کو کہتی تھی۔ دعا سے کیا انکار ہے لیکن میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ایسے ہی تم رہو۔ میں نے دل میں کہا کہ بس تو خیر صلا ہے اگر آپ دعاء بھی کریں گے جب بھی اولاد نہ ہوگی کیونکہ دلی منشا تو یہ ہے اور ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　می دہد یزداں مراد متقیں(۲)

(۱) حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کا سر کاٹا تھا اس کا راز عام لوگ نہیں سمجھ سکتے (۲) تو جو چاہتا ہے خدا بھی وہی کر دیتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کی خواہشات پوری کرتا ہے۔

میں نے کہا حضرت بس میں بھی وہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔ اولاد نہ ہونے میں بعض کے لئے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس شخص کے تعلقات دنیا میں نہیں بڑھتے اور اولاد والے کے تعلقات بہت بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ہماری پھوپی صاحبہ میرے لئے اس طرح دعا کیا کرتی تھیں کہ اے اللہ میرے بھتیجے کا بھی ساجھا دنیا میں رلا دے (یعنی اولاد دیدے) میں غصہ ہوتا تھا کہ تم مجھے کوستی ہو دنیا دار بنانا چاہتی ہو مگر یہ عنوان بتلا رہا ہے کہ اہل عرف کے نزدیک دنیا کے اندر وہی پھنستا ہے جو صاحب اولاد ہو اور اس سے خود سمجھ لو کہ جو صاحب اولاد نہ ہو وہ کیا ہوگا[۲] وہ دنیا سے بے تعلق و بے لوث ہوگا بلکہ یوں کہئے کہ اللہ والا ہوگا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اللہ والا ہونا اچھا یا دنیا والا ہونا اچھا مگر یہ بعض کے اعتبار سے ہے ورنہ بعضے اولاد والے بے تعلق رہتے ہیں اور بعض بے اولاد دنیا دار ہوتے ہیں چنانچہ اگر میرے اولاد ہوتی تو شاید میرے لئے تکلیف کا سبب ہوتی کیونکہ مجھے تعلقات سے پریشانی ہوتی ہے نیز مجھے انتظام کا ہیضہ ہے بد انتظامی سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے اور اولاد کا انتظام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ بس حاصل یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ دیں

(۲)قلت واکمل الاحوال ماکان علیه النبی صلی الله علیه وسلم وکذلك الانبیاء کانت لهم ازواج وذریة ودعا ابراهیم و زکریا علیهما السلام ان یولد لهما واستجیبا وعیسی علیه السلام یولد انه بعد النزول وفی الحدیث تزوجو الودود الولود فانی اباهی بکم الامم فینبغی ان یراعی جانب ذلك فی الکلام ۱۲ ظ۔ **ترجمہ**: ''میں کہتا ہوں کہ اولاد ہونے نہ ہونے میں درجہ کمال وہ ہے جو حضور ﷺ اور دیگر انبیاء کا ہے ان کے بیویاں بھی تھیں اولاد بھی تھی حضرت ابراہیم اور زکریا علیہما السلام نے اولاد کی دعاء کی جو قبول ہوئی حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد نزول اولاد ہوگی۔ حدیث میں ہے کثرت اولاد کے لئے نکاح کرو میں اپنی امت کی کثرت پر تمہاری وجہ سے فخر کروں گا یہی مناسب ہے کہ کلام میں اس بات کی بھی رعایت کی جائے'' (علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) حضرت تھانوی نے اسی لئے اگلے جملہ میں اس کی رعایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اولاد کا نہ ہونا بعض کے اعتبار سے بہتر ہے سب کے لئے نہیں پس جس کے ہو اس کے لئے وہی بہتر جس کے نہ ہو اس کے لئے وہی بہتر ہے (خلیل)

اس کے لئے یہی اچھا اور جس کو نہ دیں اس کے لئے یہی اچھا۔

وقت مصیبت تسلی کا طریقہ

اور جس کو دیں اور دیکر چھین لیں اس کے لئے یہی مصلحت ہے للّٰہ ما اخذولِلّٰہ ما اعطی (۱) کا یہی مطلب ہے جو حدیث میں مصائب کی تسلی کے لئے وارد ہے اور یہی مطلب ہے انا للہ کا اور اس اعتقاد کو صبر کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے اور یہ قرآن کا طرز خاص ہے کہ ہر چیز کا طریقہ ساتھ ساتھ بتلا دیا جاتا ہے یہاں صبر کا حکم تھا تو صبر کا طریقہ ساتھ ساتھ ہی بتلا دیا جیسا کہ سہولت نماز کا طریقہ بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ﴾ کہ بیشک نماز گراں ہے۔ آگے طریق سہولت مذکور ہے ﴿اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ خشوع کے بعد نماز سہل ہوجاتی ہے آگے خشوع کا طریقہ ارشاد ہے ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ جس میں خشوع کا طریقہ یہ بتلایا کہ لقاء رب اور یوم آخرت کا دھیان رکھے اسی طرح یہاں انا للّٰہ الخ کے مضمون کو تحصیل صبر میں بہت بڑا دخل ہے اور یہی وہ مضمون ہے جس کی وجہ سے حضرت ام سلیم صحابیہ نے کامل صبر فرمایا اور اپنے خاوند کو بھی صابر بنایا۔

ام سُلیم رضی اللہ عنہا کا صبر

اُن کا قصہ حدیث میں اس طرح ہے کہ ان کا ایک بچہ بیمار تھا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ باہر سے آکر اُس کا حال دریافت کیا کرتے ایک دن اُس کا انتقال ہوگیا۔ اور شام کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ آئے۔ تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ بچہ کا انتقال ہوگیا تا کہ سنکر پریشان نہ ہوں اور پریشانی میں کھانا نہ کھاسکیں بلکہ جب انہوں نے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے تو یہ جواب دیا کہ اب تو سکون ہے (یہ جھوٹ نہ تھا کیونکہ موت سے بڑھ کر کیا سکون ہوگا جس کے بعد حرکت کی امید ہی نہیں ۱۲) یہ سن کر

(۱) اللہ ہی کے لئے ہے جو اس نے لے لیا اور اللہ ہی کے لئے ہے جو اس نے دے دیا۔

انہوں نے کھانا کھایا اور رات کو بیوی کی طرف میلان بھی ہوا بیوی نے بے انتہا صبر کیا کہ اس سے بھی انکار نہ کیا جب صبح ہوئی تو کہا کہ میں تم سے ایک مسئلہ پوچھتی ہوں بھلا اگر کسی نے ہم کو کوئی چیز بطور امانت کے دی ہو پھر بعد میں وہ اپنی امانت کو واپس لینا چاہے تو کیا کرنا چاہئے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہی چاہئے کہ جب مالک اس کو واپس لینا چاہے تو بڑی خوشی سے واپس کر دیا جائے۔ حضرت ام سلیمؓ نے کہا تو اپنے بچہ پر صبر کرو اور خوشی کے ساتھ اُس کے دفن کا سامان کرو کیونکہ خدا نے اپنی امانت لے لی ہے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بڑے جھلائے کہ تم نے رات ہی کیوں نہ خبر کی کہا کیا ہوتا رات کو دفن کرنے میں مصیبت ہوتی اور رات بھر پریشان رہتے کھانا بھی نہ کھاتے اس لئے رات خبر نہیں کی رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ گئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ام سلیم رضی اللہ عنہا کا فعل بہت پسند آیا اور میں امید کرتا ہوں کہ آج رات تم دونوں کو خدا نے مبارک اولاد عطا فرمائی ہے (چنانچہ عبداللہ بن طلحہ پیدا ہوئے جو بڑے عالم بڑے سخی اور صاحب اموال واولاد تھے ۱۲) تو حضرت ام سلیم نے سچ فرمایا کہ یہ اولاد اللہ کی امانت ہے اس کو جب وہ لینا چاہیں خوش ہو کر خدا کے حوالہ کر دینا چاہئے۔

سوال وجواب

اس پر شاید یہ سوال ہوگا کہ یہ امانت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت کیوں دی ہے اسکا جواب یہ ہے تا کہ پرورش ہو سکے کیونکہ بدوں محبت کے اس گوہ کے ڈھیر (۱) کی پرورش کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے غیر کی اولاد کا پالنا بہت دشوار ہے اور جب بچہ کی پرورش ہو چکتی ہے تو محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بیٹے کے ساتھ ویسی محبت نہیں ہوتی جیسی چھوٹے سے ہوتی ہے غرض اولاد کو بھی خدا کی چیز سمجھو کہ اس کی امانت چند روزہ ہمارے پاس ہے پھر اس کے فوت

(۱) پاخانے کے ڈھیر کی کیوں کہ بچے پیشاب پاخانہ کرتے رہتے ہیں جو ماں کو ہر وقت صاف کرنا پڑتا ہے۔

ہونے پر زیادہ ملال نہ ہوگا کیونکہ پریشانی کی بنا تو یہی ہے کہ تم ان کو اپنی چیز سمجھتے ہو اور یہ سمجھ کر ان کے متعلق تجویزیں کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی مالک بھی وہی ہیں مَلک (۱) بھی وہی ہیں یہاں مُلک سے مُلک کامل مراد ہے جس کے ساتھ مِلک بھی جمع ہو کیونکہ بدوں اس کے ملک ناقص ہے اور خدا نقصان سے بری ہے۔

قراءات متعددہ کا فائدہ

اسی لئے ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میں مالکیت اور ملکیت دونوں کو جمع کیا گیا ہے دو قراءتوں میں اور قراءتین بمنزلہ آیتین کے ہیں (۲) ہر ایک کا مفہوم ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ ضرورت دونوں کی ہے ایک جہت سے ملکیت میں قوت ہے اور ایک جہت سے مالکیت میں اس لئے مقصود دونوں کو جمع کرنا ہے اسی لئے میں نے کہا کہ یہاں مُلک سے مراد ملک کامل ہے یا یوں کہو کہ لام (لہٗ میں) مِلک کے لئے ہے تو مالک ہونا اسی سے ثابت اور ملک ہونا لفظ ملک سے ثابت۔ اور ایک آیت میں دو قراءتوں کو ایک ساتھ عمل میں جمع کر کے احکام مستنبط (۳) کئے ہیں اسی طرح میں نے ﴿وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ میں دونوں قراءتوں کو جمع کیا ہے کہ دونوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ پیروں کو مل مل کر دھویا کرو کیونکہ ان پر پانی بہالینا عموماً کافی نہیں ہوتا اسی لئے فقہاء نے دلک کو مطلقاً اور دلک رجلین کو خصوصاً مستحب کہا ہے (۴) اسی طرح ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میں دونوں کو جمع کیا گیا ہے مطلب یہ کہ وہ مالک بھی ہیں ملک بھی ہیں تو اب جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ مُلک مطلق آیا ہے وہاں یہی مجموعہ مراد ہوگا ورنہ محض ایک کے اعتبار میں نقص لازم آتا ہے۔

(۱) مالک بھی ہیں بادشاہ بھی (۲) دو قرائتیں بمنزل دو آیتوں کے ہیں (۳) مسائل نکالے (۴) وضوء کرتے وقت اعضاء کو ملکر دھونے کو اور خصوصاً پیروں کو مل کر دھونے کو مستحب کہا ہے۔

خلاصہ سلوک

اور یہی نکتہ ہے ﴿مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ میں دولفظوں کے جمع کرنے میں کیونکہ ولی دوست کو کہتے ہیں خواہ وہ نصرت (۱) پر قادر ہو یا عاجز ہو اور نصیر مددگار ومعاون کو کہتے ہیں خواہ دوست ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کو تم سے تعلق بھی ہے اور وہ تمہاری نصرت واعانت پر بھی قادر ہیں اور اس مضمون کو صیغۂ حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی یارومددگار نہیں۔ اس حصر میں اس طرف اشارہ ہے کہ بس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شئے سے تعلق نہ ہوگا تو پھر کسی شے کے فوت ہونے سے زیادہ قلق (۲) وغم بھی نہ ہوگا بلکہ اس وقت حق تعالیٰ کو خطاب کر کے یوں کہے گا ۔

روزہا گر رفت گورو باک نیست تو بماں اے آنکہ تو پاک نیست (۳)

سالکین کو تنبیہ

بس اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں البتہ اخیر میں سالکین کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں نے بیان کیا ہے جس طرح یہ مصائب دنیا کا خاتمہ کرنے والا ہے اسی طرح سلوک کی تمام پریشانیوں کا بھی قلع قمع کرنے والا ہے کیونکہ سلوک کی تمامتر پریشانیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کو ثمرات واحوال کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے اور ان کے متعلق اپنی تجویزیں اور امیدیں قائم کرلیتا ہے جب تجویز کے خلاف ثمرات و کیفیات کے ظہور میں دیر ہوتی ہے تو پریشان ہوتا اور شیخ سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ اور اس وقت کے بیان کا حاصل یہی ہے کہ بندہ کو تجویز

(۱) مدد کرنے پر قادر ہو یا نہ ہو (۲) رنج (۳) روزانہ بھی اگر قبرستان جاؤں تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ تو میرے ساتھ ہے اس لئے مجھے کوئی خوف نہیں۔

کا کچھ حق نہیں تم اپنی تجویز کو قطع کرو دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں تو اس کو چھوڑ کر غیر سے دل لگانا غلطی ہے اور ثمرات و کیفیات غیر حق ہیں اس لئے ان کا طالب نہ ہونا چاہئے ۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از وغیر او تمنائی(۱)

اور ثمرات سے مراد ثمرات غیر اختیاریہ ہیں ثمرات اختیاریہ مراد نہیں شاید کوئی عام سمجھ کر اختیاریات کے فوت پر بھی راضی رہا کرے ہرگز نہیں کیونکہ اختیاری امور میں اپنے اختیار کا صرف کرنا واجب ہے ہاں ثمرات غیر اختیاریہ کے عدم حصول یا فوت سے غم نہ کرے بس سمجھ لے کہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے ان کی یہی تجویز ہے مجھے اس پر راضی رہنا چاہئے ۔

باغباں گر پنج روزی صحبت گل بایدش بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل نبایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش(۲)

سالکین پر بوجھ

سالکین کو بعض احوال ایسے پیش آتے ہیں کہ میں قسم تو نہیں کھاتا گو غلبہ ظن پر قسم کھانا بھی جائز ہے کہ اگر یہ حالات پہاڑ پر وارد ہوں تو پہاڑ پھٹ جائے۔ اور وحی کے متعلق تو خود نص میں وارد ہے ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ (۳) یہ تو پہاڑ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر اس پر قرآن نازل ہوتا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور حضور کا تحمل مشاہد ہے کہ آپ نے تیئس سال تک نزول قرآن کا ثقل (۴) برداشت فرمایا اور وحی میں یہ اثر

(۱) فراق وصال سے کیا ہوتا ہے دوست کی رضا کے طالب بنو کیوں کے محبوب سے اس کے علاوہ کو طلب کرنے پر افسوس ہے (۲) باغباں اگر پانچ دن پھولوں کی صحبت میں رہا ہے تو جدائی کے کانٹوں پر بلبل کے صبر کو نہیں پہنچ سکتا۔ عاشق کو جو محبوب کی زلف کا اسیر ہو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ سمجھدار پرندہ جب جال میں پھنس جائے تو اس کو صبر سے کام لینا چاہئے (۳) سورۃ حشر: ۲۱ (۴) بوجھ۔

عالم ملکوت سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہے اسی پر دوسرے حالات کو قیاس کرلو جو عالم ملکوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پہاڑ تو کیا چیز ہے عارفین نے تو اس امانت کا بار اٹھا رکھا ہے جس کے اٹھانے سے زمین و آسمان بھی عاجز تھے ۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند(۱)

توسالکین پر اگر ایسے حالات طاری ہوں جن سے پہاڑ پھٹ جائے تو کیا تعجب ہے، تو ان کو اس مضمون کی، کہ کیفیات کے متعلق خود کچھ تجویز نہ کرو اور ہر کیفیت کو خیر سمجھو بہت قدر ہوگی اُس وقت اس سے بہت سہارا ملے گا اور رنج وغم زائل ہوجائیگا۔

تعلق مع اللہ کا فائدہ

صاحبو! واللہ اگر حق تعالیٰ سے تعلق ہوجائے تو سب کا فنا ہوجانا بھی سہل ہوجائے۔ اور جس کو تعلق مع اللہ نصیب ہوگیا اور تفویض محض اختیار کرلی اُس کے سامنے دنیا کے واقعات کیا چیز ہیں ان کو تو وہ چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ صاحبو! تم اسی غرض سے سلوک اختیار کرلو کہ اس کے ذریعہ سے حوادث و مصائب سہل ہوجائیں گے سالک کے سامنے واقعات دنیویہ کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود سبکتگین کے لشکر میں نقارۂ جنگ اٹھانے والے اونٹ تھے یہ نقارے بہت بڑے بڑے بھاری ہوتے تھے۔ ایک دفعہ لشکر جارہا تھا اور نقارۂ جنگ کا اونٹ ایک کھیت میں سے گذرا کاشتکار کے لڑکے نے ڈھپڑیا(۲) بجائی تا کہ اس کی آواز سے اونٹ بدک کر کھیت میں سے نکل جائے۔ ڈھپڑیا کو دیکھ کر اونٹ بہت ہنسا کہ میری کمر پر تو اتنا بڑا نقارہ(۳) بجتا ہے جس کی صدا سے زمین و آسمان گونج اٹھتی ہیں اُس سے تو میں ڈرتا ہی نہیں تیری ڈھپڑیا سے ضرور ڈروں گا۔ حضرت جس کی کمر پر کوس محمودی(۵) رکھا ہوا ہو اس کو دنیا کی ڈھپڑیا کب پریشان کرسکتی ہے بس انہوں نے ایک غم لے

(۱) آسمان جس بار امانت کو نہیں اٹھاسکا اس کو اٹھانے کی ذمہ داری میرے ناتواں کاندھوں پر ڈالدی گئی ہے (۲) چھوٹی سی ڈھولکی (۳) بڑا ڈھول (۴) سلطان محمود کا عظیم ڈھول رکھا ہوا ہو اس کو یہ چھوٹی سی ڈھولکی کیا ڈرائے گی۔

لیا ہے جس نے عصائے موسیٰ کی طرح غم کے تمام سانپوں کو نگل لیا ہے۔

اہل اللہ کی خوشی

اور خوشی بھی ان کو ایسی ہے کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں لو علم الملوك بما عندنا لجادلونا بالسيوف کہ اگر باشاہوں کو اس دولت کی خبر ہوتی جو ہمارے پاس ہے تو وہ تلواریں لیکر ہم پر چڑھ آتے اور اس دولت کو چھیننے کی کوشش کرتے۔

اور وہ ہر حال میں خوش کیوں نہ ہوں جبکہ جانتے ہیں کہ مصیبت وغم سب محبوب کا دیا ہوا ہے پھر خوشی کیوں نہ ہو ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من(۱)

محبوب اگر عاشق کو آغوش میں لیکر زور سے دبانے لگے تو کیا عاشق کو اس سے رنج ہوگا ہرگز نہیں گو ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور گو اس کے منہ سے آہ و نالہ (۲) نکل جائے مگر دل سے خوش ہوگا اور یوں کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۳)

وہ آغوش سے نکلنا کبھی نہ چاہے گا بلکہ آغوش یار ہی میں مرجانا چاہے گا اور یوں کہے گا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

وقت مصیبت کا مراقبہ

اور اگر اس حالت میں کوئی دوسرا بھی اس کو مارنے لگے تو یوں کہے گا ؎

بجرم عشق تو ام می کشند وغوغائیست تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست (۴)

(۱) مجھے وہ ناپسندیدہ بات بھی پسند ہے جو تجھے خوش کردے کیونکہ میرا دل تجھ پر قربان ہے میری طرف سے تجھے کوئی رنج نہ پہنچے (۲) فریاد (۳) دشمن کے مقدر میں یہ بات نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو تیرے دوستوں کا سر حاضر ہے تو اس پر خنجر آزمائی کرلے (۴) تیرے عشق کی پاداش میں مجھے مارا جارہا ہے اور شور برپا کیا جارہا ہے تو بھی دروازے پر آکر دیکھ کیا خوب تماشا ہے۔

اس وقت اس مراقبہ سے کہ محبوب مجھے دیکھ رہا ہے تمام کلفت آسان ہوجاتی ہے اور یہی مراقبہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حوادث کے وقت تعلیم فرمایا ہے: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (۱) خلاصہ علاج کا یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ اور غیر خدا سے حالاً وعملاً وقالاً تعلق کم کرو پھر دنیا وآخرت کی راحت تمہارے ہی لئے ہے اگر فقر وفاقہ بھی ہوا جب بھی تم کو راحت وچین ہی ہوگا اور اس شعر کے مصداق ہوجاؤ گے ۔

اے دل آن بہ کہ خراب ازمی گلگوں باشی　　بے زروگنج بصد حشمت قاروں باشی (۲)

بدون سرمایہ اور سامان کے تم سلاطین سے بڑھ کر سلطان ہوگے اور بادشاہوں کو خطاب کرکے تم یوں کہو گے ۔

کہیں حقیر گدایان عشق راکین قوم　　شہانِ بے کمر وخسروانِ بے کلہ اند (۳)

اور یوں کہو گے۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　کہ ناز بر فلک وحکم برستارہ کنم (۴)

یعنی آپ کو حیات طیبہ حاصل ہوجائے گی یہ تو زندگی کی حالت ہو۔

موت کے وقت محبین کا حال

اور مرتے ہوئے یہ حالت ہوگی ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۝﴾ (۵)

یعنی مرتے ہوئے فرشتے بشارتیں دیں گے خوشخبری سنائیں گے جس سے

(۱) اپنے رب کے حکم پر صبر کیجئے آپ ہمارے پیش نظر ہیں (۲) میرا دل کب پریشان ہوسکتا ہے جبکہ اس میں محبوب ہے۔ بغیر خزانے اور سونے چاندی کے میں قارون سے بھی بڑھ کر ہوں (۳) عشق کے میدان کے فقیروں کو حقیر نہ سمجھو بغیر ہے کہ دوستار کے وہ بادشاہ ہیں (۴) میکدہ کا فقیر ہوں لیکن مستی کے وقت آسمان وستاروں پر حکم کرتا ہوں (۵) حم سجدہ: ۳۰۔۳۲۔

ہر نیک بندہ کو اپنے اصلی گھر کا اشتیاق و انتظار ہو جاتا ہے اسی لئے تعجیل جنازہ کا امر ہے[1] اب سمجھ لو کہ یہ موت کیسی خوشی کی چیز ہوگی اور قبر میں یہ ہوگا کہ جنت کی طرف کھڑکیاں کھل جائیں گی وہاں بھی فرشتے بشارتیں سنائیں گے۔ اور میدان حشر میں یہ حال ہوگا ﴿لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ میں نے مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا ہے ۔

عاشقانرا با قیامت روز محشر کار نیست ... عاشقان را جز تماشائے جمال یار نیست[2]

پاکیزہ زندگی

حدیث میں بھی تو آیا ہے کہ قیامت کا دن کافر کے لئے پچاس ہزار سال کا ہوگا اور مومن کو ایسا معلوم ہوگا جیسے فرض نماز کا وقت۔ اور پلصراط پر گذرتے ہوئے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ یوں کہے گی جزء یا موء من فان نورك اطفـأناری کہ اے مومن جلدی پار ہو جا کہ تیرے نور کی برودت[3] نے تو میری نار کی حرارت ہی کو بجھادیا بتلائیے یہ پاکیزہ زندگی اچھی ہے یا یہ کتے جیسی جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں پس تعلق مع اللہ حاصل کرو جس کا تفصیلی طریقہ اس طرح معلوم ہوگا کہ کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدو یعنی اپنے کو اس کے سپرد کردو۔ بس پھر جنت ہی جنت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اب میں ختم کر چکا دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنے ساتھ تعلق عطا فرمائے اور فہم سلیم اور عمل نصیب ہو آمین۔

وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔[4]

---

(۱) جنازہ جلدی اٹھانے کا حکم ہے (۲) روز محشر عاشقوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی عاشقوں کو تو صرف جمال یار (اللہ) کے دیدار کا شوق ہوگا (۳) ٹھنڈک (۴) اللہ تعالیٰ اس وعظ سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور مصیبت زدہ لوگوں کے لئے تسلی کا باعث بنائے۔ آمین ۔

خلیل احمد تھانوی ۲۹/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ